مہوش افتخار

کرے سنہرے خواب کوئی

ڈائننگ روم کی خاموش فضامیں چھری اور کانٹے کی آواز کے سوا دوسری کوئی آواز نہ تھی۔ حالانکہ وہاں اس وقت ٹیبل کے گرد تین افراد کرسیاں سنبھالے بیٹھے تھے۔ دن کے تین پہروں میں سے یہ وہ واحد وقت ہوتا تھا جب اس عظیم الشان عمارت کے مصروف مکینوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔ لیکن ایسے میں بھی وہاں سوائے ضرورت کی بات چیت کے دوسری کوئی بات نہ ہوتی تھی۔

شاید اس مکان میں ہر کام ہی ضرورت کے فلسفے کے تحت ہوتا تھا۔ جسے دیکھ کر علی شہریاران کے دل میں اکثر یہ خواہش ابھرتی کہ وہ اس محل کی پیشانی پہ سجا "باران ولا" مٹا کر "ضرورت ولا" لکھوا دے۔ لیکن پھر اس خوب صورت محل کے مکینوں کی قسمت پہ رشک کون کرتا، جو دولت، عزت، شہرت اور طاقت کے لیے جانے جاتے تھے۔ مگر ایک دوسرے کے لیے جذبات کے معاملے میں کسی کھنکتے ہوئے برتن کی طرح بالکل خالی تھے۔

دراصل اس عمارت کی بنیاد ہی ضرورت کی اینٹ پہ رکھی گئی تھی۔ جس کے تحت رضا باران اور عالیہ تنویر کی شادی اپنے والدین کے بزنس اور سیاسی مستقبل کو مضبوط بنانے کے لیے کی گئی تھی۔ اس بات کی پروا کیے بنا کہ دونوں کے مزاجوں میں نہ صرف زمین آسمان کا فرق تھا بلکہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بے حد ضدی اور خود سر طبیعت کے مالک تھے۔

اگر علیحدگی کی صورت میں اپنے حصے کی پچاس فیصد جائیداد سے ہاتھ دھونے کا خدشہ نہ ہوتا تو وہ دونوں کب کے اس زبردستی کے تعلق کو ختم کر کے آگے بڑھ چکے ہوتے، مگر اسے ان کے والدین کی ہوشیاری

مکمل ناول

کیسے یا ان دونوں کی بدنصیبی کہ وہ ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے پر مجبور تھے اور اسی مجبوری کے تحت جو گھر عمل میں آیا تھا وہ اتنا کمزور اور بکھرا ہوا تھا کہ علی شیر کا سارا بچپن اپنے ماں باپ کی بھرپور توجہ اور محبت کے لیے ترستے ہوئے گزرا تھا۔ مگر صرف بچپن.... بعد ازاں وہ بھی ان ہی کے رنگ میں رنگ گیا تھا۔

بے حس اور اپنے حال میں مگن۔ جس کے لیے پیسہ اور طاقت ہی خوشی اور سرور کا باعث تھا۔

وہ اپنے باپ کی پارٹی کے "یوتھ ونگ" کا صدر تھا۔ اس کی بے حد شان دار شخصیت اور غیر معمولی ذہانت نے اسے بے شمار نوجوانوں کا آئیڈیل اور ان گنت دلوں کی دھڑکن بنا ڈالا تھا۔

ان نازک دلوں سے کھیلنا وہ اپنا حق سمجھتا تھا۔ لیکن محض وقتی طور پہ۔ کسی کو مستقل بنیادوں پہ اپنی زندگی میں شامل کرنے کا اس میں حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ کہیں اس کی ٹوٹی بکھری شخصیت ایک اور ٹوٹے ہوئے گھر کو جنم نہ دے۔ حالانکہ اندر کہیں ایک آسودہ اور مکمل زندگی کی آرزو ہر گزرتے سال کے ساتھ زور پکڑتی جا رہی تھی اور تو اور اس کی اس تیسویں سالگرہ پہ عالیہ بیگم بھی اپنی تمام تر شخصی آزادی ایک طرف رکھتے ہوئے اسے شادی کے لیے کہنے پہ مجبور ہو گئی تھیں۔

ان کا مطالبہ اس کے لبوں پہ اک طنزیہ مسکراہٹ بکھیر گیا تھا۔ اسے اس لفظ سے متنفر کرنے والی اور عورت ذات سے بے اعتبار کرنے والی وہی تو تھیں۔

وہ اپنی اولاد کے سامنے اپنی بربادی کی دہائیاں اور اپنی شریک سفر کی ذات کی دھجیاں اسی طرح نہیں اڑانا چاہتا تھا، جس طرح اس کے ماں باپ ایک دوسرے کی یا اس وقت اس کی ماں اس کے باپ کی اڑا رہی تھیں۔ جن کا تازہ اسکینڈل آج صبح کے اخبار کی زینت بن کے عالیہ باران کے اشتعال کو ہوا دینے کے ساتھ ساتھ ڈائننگ روم میں چھائی خاموشی بھی توڑ گیا تھا۔

"میں پوچھتی ہوں تمہیں شرم نہیں آتی' اس عمر میں یہ گھٹیا حرکتیں کرتے ہوئے؟" انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے اپنے دائیں جانب بیٹھے رضا باران کو گھورتے ہوئے اخبار پہ ہاتھ مارا۔ ان کے برعکس علی شیر پہ اس خبر یا ماں کے غصے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اب بھی اسی اطمینان سے ناشتے میں مصروف تھا جتنا کہ چند لمحے پیشتر تھا۔ بلکہ اثر تو رضا صاحب پر بھی کچھ خاص نہ ہوا تھا۔

"نہیں!" وہ ان کی جانب دیکھے بنا بے نیازی سے بولے تو عالیہ کے پیروں سے لگی اور سر پہ بجھی۔

"تم رضا باران! ایک گھٹیا آدمی تھے' ہو اور رہو گے۔"

"اور تم عالیہ تنویر! ایک بدزبان عورت تھیں' ہو اور رہو گی۔ تمہاری ایسی حرکتیں ہیں جو مجھے یہ سب کرنے پہ مجبور کرتی ہیں۔ تم میں کوئی ایک بھی خوبی نہیں جو مجھے تم سے باندھ کر رکھتی۔" وہ بھی ملازموں کی پروا کیے بنا دوبدو چلائے تھے۔

"اپنے گناہوں کی گٹھڑی میرے کندھے پہ لادنے کی ضرورت نہیں اور تم ہو کیا جو میں تمہیں خود سے باندھ کر رکھتی؟ تم رضا باران در حقیقت عالیہ تنویر کے قابل ہی نہیں تھے۔"

وہ اپنی تمام تر نزاکت اور تہذیب ایک طرف رکھتی ان سے بھی زیادہ اونچی آواز میں چلائی تھیں۔ مگر اس سے پہلے کہ غصے سے لال پیلے ہوتے رضا صاحب کوئی جواب دیتے' پرسکون سا علی شیر نیپکن سے منہ صاف کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"پاپا! میں آفس جا رہا ہوں۔ آپ چلیں گے کیا؟"

"ہاں چلو بیٹا۔ اس جاہل عورت کے ہوتے ہوئے بھلا کون ناشتا کر سکتا ہے۔" وہ انہیں گھورتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر کی جانب بڑھ گئے تھے اور پیچھے پیچ و تاب کھاتی عالیہ کتنی ہی دیر با آواز بلند انہیں کوستی رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"صوفیہ! کہاں ہو بھئی؟ ڈرائنگ روم میں رخشی

بھابھی اور اکبر بچوں کے ساتھ آئے بیٹھے ہیں۔"

فصیح الحسن عجلت میں لاؤنج میں داخل ہوئے تھے جہاں صوفیہ چند مہمان خواتین کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ شوہر کی اطلاع پہ وہ اگلے ہی لمحے ان سے معذرت کرتی تیز قدموں سے ڈرائنگ روم کی جانب چلی آئی تھیں جہاں فصیح صاحب کی بیٹی علینہ کے سسرال والے آئے ہوئے تھے۔ باقی خاندان والے بھی وہیں موجود تھے۔ اکبر اعوان کے بیٹے اسد اعوان سے ان کی بیٹی علینہ کی منگنی ابھی چند ماہ قبل ہی ہوئی تھی۔

"السلام علیکم!" خوش دلی سے سلام کرتی وہ تپاک سے اپنی سمدھن کی طرف بڑھی تھیں۔ جو اپنے چہرے پہ زبردستی کی مسکراہٹ سجائے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"شکر ہے' تمہیں ہم سے ملنے کی فرصت تو ملی۔" تکلف سے صوفیہ کو گلے لگاتے ہوئے وہ ان کی چند لمحوں کی تاخیر جتائے بنا نہ رہ سکی تھیں۔

اتنے لوگوں کے درمیان ان کا انداز نہ چاہتے ہوئے بھی صوفیہ بیگم کی مسکراہٹ پھیکی کر گیا تھا۔ رخشندہ اعوان کے مزاج کی نزاکت کے پیش نظر ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ ان سے کوئی کوتاہی نہ ہو۔ خصوصاً علینہ کی منگنی کے بعد سے تو وہ اور بھی زیادہ محتاط رہنے لگی تھیں کہ اس رشتے میں زیادہ عمل دخل اسد اور اکبر اعوان کی پسند کو تھا۔ مگر وہ پھر بھی ہر بار کوئی نہ کوئی نکتہ اعتراض ڈھونڈ ہی لیتی تھیں۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں بھابھی! آپ تو ہمارے لیے سب سے بڑھ کے ہیں۔" جواب صوفیہ کے بجائے فصیح صاحب نے مسکراتے ہوئے دیا تو رخشندہ بیگم کے چہرے پر اک طنزیہ مسکراہٹ در آئی۔

"اوہو' چھوڑو بھی یہ فضول کی باتیں۔ انہیں مبارک باد تو دو۔" اکبر صاحب اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "بھابھی! آپ کو اتنی بڑی سعادت کی بہت مبارک ہو۔"

"خیر مبارک بھائی جان! اللہ پاک آپ لوگوں کو بھی جلد اپنے گھر کی زیارت نصیب کرے۔" وہ متانت سے مسکراتے ہوئے اسد کی جانب متوجہ ہوئی تھیں جو انہیں مبارک باد دینے کے لیے اٹھ کر آگے بڑھا تھا۔ اس کے پیچھے فروا اور فریحہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"فروا آپی اور فریحہ! آپ لوگ لان میں چلیں' وہاں سب کزنز بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ بھی آجائیں اسد!" بڑوں کو اپنی باتوں میں مصروف دیکھ کر وہ آداب میزبانی نبھانے کو مسکراتے ہوئے بولی تو فروا ایک نظر اٹھنے کے لیے پر تولتے بھائی پر ڈالتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں بولی۔

"نو تھینک یو۔ ہم تینوں یہیں ٹھیک ہیں۔" اس کے روکھے جواب پہ جہاں علینہ کی مسکراہٹ سمٹی تھی' وہیں اس کی نظریں پہلے فروا اور پھر اسد کی جانب اٹھی تھیں۔ جو اپنی خفت چھپانے کو بے اختیار نگاہیں چراتا سیدھا بیٹھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کم آن علینہ! اب تو ناراضی ختم کر دو یار!"

"پلیز اسد۔ میں کوئی ناراض نہیں۔ آپ بس اب مجھے جانے دیں۔" وہ خفا خفا سی اپنی کتابیں اور فائل سمیٹتے ہوئے بولی۔ تو اسد نے دھیرے سے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ دونوں اس وقت یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں تھے۔ جہاں اسد تیسرے پریڈ کے بعد اسے بصد اصرار' اس کے ڈپارٹمنٹ سے لے کر آیا تھا۔

کل یوں سب کے درمیان فروا کے دو ٹوک انکار پہ علینہ کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔ جو پھر ان کی واپسی تک بحال نہ ہو سکی تھی۔ اس کی یہ خاموشی اسد نے با آسانی محسوس کی تھی' مگر وہ ہمیشہ کی طرح اپنی ماں اور بہنوں کی موجودگی کے باعث خاموش رہا تھا۔ لیکن آج صبح موقع ملتے ہی وہ اس کے پاس چلا آیا تھا۔

"پلیز' آپ کو پتا ہے مجھے یہ سب پسند نہیں۔" اس

نے ہلکی سی ناگواری کے ساتھ اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا تھا لیکن اسد نے یک لخت ہی اس کے ہاتھ پہ اپنی گرفت مضبوط کردی تھی۔

"فار گاڈ سیک' ہماری منگنی ہو چکی ہے یار!"

"شکر ہے' آپ کو یہ تو یاد ہے کہ ہمارے درمیان کوئی رشتہ بھی ہے۔ لیکن آپ شاید یہ بھول گئے ہیں اسد! کہ یہ رشتہ آپ کی شدید خواہش پہ ہوا تھا۔ ورنہ میری تو آپ سے سوائے سلام دعا کے شاید ہی کبھی کوئی بات ہوئی ہو۔" وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے افسردگی سے بولی تو وہ قصداً" بات کو ہلکا رخ دینے کے لیے شرارت سے مسکرا دیا۔

"اور تمہاری یہی بے نیازی تو میرا دل لے اڑی تھی۔"

"اور اب شاید آپ کا یہی دل بھر چکا ہے۔" علینہ کے لبوں پہ اک تلخ مسکراہٹ آن ٹھہری تو اسد اک گہری سانس لیتا سیدھا ہو بیٹھا۔

"دیکھو علینہ! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ہمارے گھر میں' میرے علاوہ اگر کوئی اس رشتہ پہ راضی تھا تو وہ صرف ڈیڈی تھے۔ باقی مما یا فروا اور فریحہ اس رشتے کے لیے بالکل تیار نہیں تھیں کیونکہ وہ میری شادی فروا کی بیسٹ فرینڈ سے کروانا چاہتی تھیں۔ لیکن میں نے اپنی محبت کی خاطر اسٹینڈ لیا' انہیں منایا۔ اب تم بھی تو میری خاطر تھوڑا سا کمپرومائز کرنے کی کوشش کرو نا۔ تم دیکھنا آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کا ہاتھ تھامے وہ دھیرے دھیرے اسے سمجھا رہا تھا اور علینہ کا دل چاہا تھا کہ وہ اس سے پوچھے کہ جب آپ نے سب کچھ اپنی خواہش اور اپنی خوشی کے لیے کیا تھا تو اب کمپرومائز کا سارا بوجھ تنہا اس کے شانوں پہ کیوں ڈال دیا گیا تھا؟ کیوں وہ اسے اپنی زندگی میں شامل کر کے یہ بھول رہا تھا کہ وہ تو فقط اس کے سہارے اس گھر میں آنے والی تھی اور اگر وہی بے رخی برتتا رہے تو اس کا کیا بنتا۔

"اچھا اب بتاؤ کیا لو گی؟" اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے اسد نے موضوع بدل دیا۔

"کچھ نہیں۔ میری کلاس شروع ہونے والی ہے۔" وہ آہستگی سے بولی تو اسد نے بھی اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے گھڑی پہ نگاہ ڈالی۔

"مجھے بھی دس منٹ تک آڈیٹوریم میں پہنچنا ہے۔"

"کس سلسلے میں؟" علینہ نے نگاہ اٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"پارٹی میٹنگ ہے۔"

"اسد! یہ آپ کن چکروں میں پڑ گئے ہیں؟ یہ سیاست تو سوائے وقت کے زیاں اور فضول قسم کے لڑائی جھگڑوں کے اور کچھ نہیں ہوتی۔"

"نہیں یار! کسی بھی پولیٹکل پارٹی سے وابستگی' آپ کے اسٹیٹس اور پوزیشن میں بڑا فرق پیدا کرتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں تم بھی ہماری پارٹی جوائن کر لو۔ ہمیں ویسے بھی فی میل ممبرز کی ضرورت ہے۔"

"نو تھینک یو! مجھے ان خرافات میں پڑنے کا شوق نہیں۔" وہ منہ بنا کر اپنی چیزیں سمیٹتی اٹھ کھڑی ہوئی تو اسد بھی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

"ایز یو وش۔ لیکن ایک بار اپنی کلاس فیلوز سے ضرور پوچھ لینا۔ کیا پتا کوئی باذوق لڑکی ہمارے نقش قدم پہ چلنا چاہے۔" وہ ہاتھ میں پکڑے سن گلاسز لگاتے ہوئے شرارت سے بولا تو علینہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

"پھر اپنی یہ پولیٹکل کیمپین بھی کسی باذوق سے کروائیں۔ بلکہ شادی بھی پھر اسی باذوق سے کریجیے گا کم از کم میری جان تو چھوٹے گی۔" وہ تن فن کرتی باہر کی جانب بڑھ گئی تو کھلکھلا کر ہنستا اسد تیز قدموں سے اس کے پیچھے چل دیا۔

☼ ☼ ☼

اپنے شان دار آفس میں بیٹھا' وہ اپنے لیپ ٹاپ پہ مصروف تھا۔ جب انٹر کام پہ اس کی پی اے نے یونیورسٹی سے آنے والے دو حضرات کی آمد کے متعلق اسے مطلع کیا تھا۔ انہیں اندر بھیجنے کا کہہ کے وہ ایک بار پھر اسکرین کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ جب چند لمحوں بعد ہلکی سی دستک دے کے داور اور مغیث اندر چلے آئے تھے۔

"السلام علیکم سر!" دونوں پرجوش سے آگے بڑھے تو علی شیر بھی اپنی کرسی سے اٹھ کر ان سے مصافحہ کرنے لگا۔ اس کی یہی چھوٹی چھوٹی سی اخلاقیات تھیں جو اسے ہر دل عزیز لیڈر بنا گئی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ اپنی بھرپور ذہانت کا صحیح اور بروقت استعمال کرنا خوب جانتا تھا۔

"کوئی نئی تازی سناؤ؟" وہ انہیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے بولا۔

"نئی تازی تو کوئی خاص نہیں بس وہ اسد اعوان آج کل بڑا فارم میں آیا ہوا ہے۔ آصف میر کا بڑا منظور نظر بنا ہوا ہے۔" داور نے مخالف پارٹی کے یونیورسٹی سیکریٹری کا نام لیا تو علی شیر کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں در آئیں۔

"کون اسد اعوان؟ وہ جس نے پچھلے سال میر کی پارٹی جوائن کی تھی؟"

"جی سر وہی۔" داور نے اس کے خیال کی تصدیق کی تو ایک محظوظ سی مسکراہٹ علی شیر کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔

"پھر تو خاصی تیز چیز ہو گا جو اتنے کم عرصے میں میر کے برابر آکھڑا ہوا ہے۔"

"ایسا ویسا۔ ایک نمبر کا ہوشیار آدمی ہے سر۔" مغیث نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تو وہ پرسوچ انداز میں محض ہنکارا بھر کے رہ گیا۔

"سر! اگر آپ کہیں تو ہم اسے آفر کر کے دیکھیں۔" مغیث نے ایک نظر داور پہ ڈالی۔

"اوں۔۔۔ ہوں۔۔۔۔ وہ اس وقت اپنا سیاسی کیریئر بنانے کے چکر میں ہے۔ پارٹی بدل کے وہ کبھی بھی اپنی سال بھر کی محنت پہ پانی نہیں پھیرے گا۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"تم ایسا کرو' اس کے بارے میں کمپلیٹ انفارمیشن اکٹھی کر کے مجھے دو' پھر اسے صحیح وقت پہ صحیح طریقے سے ہینڈل کریں گے۔"

"او کے سر! اب ہمیں اجازت؟"

"ایسے کیسے اجازت؟ چائے پی کے جانا۔" انہیں دوستانہ انداز میں ڈپٹتے ہوئے اس نے انٹر کام کا ریسیور اٹھا کے کان سے لگایا تو دونوں لڑکے مسکرا دیے۔

☼ ☼ ☼

بیش قیمت فانوسوں سے سجا وسیع و عریض ہال بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ طبلے کی تھاپ پہ مہارت سے تھرکتے پیر اور ان میں بندھے گھنگرو اردگرد بیٹھے بت سے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے 2 خوبصورت ناول

دل کے موسم
قیمت 250 روپے
مریم عزیز

ننگے پاؤں
قیمت 250 روپے
نگہت سیما

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37، اردو بازار، کراچی

مدہوش مردوں کو اپنے ساتھ دیوانہ کیے دے رہے تھے۔

ملک کے کتنے ہی معزز اور معروف سیاست دان‘ بزنس مینز اور بیوروکریٹس ‘اس وقت چند ناچنے والیوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں بنے کس قدر مضحکہ خیز لگ رہے تھے‘ یہ کوئی اس سے پوچھتا جو اس سارے تماشے کو اجنبی نگاہوں سے تکتا ہاتھ میں پکڑے مشروب کو گھونٹ گھونٹ اپنے اندر اتار رہا تھا۔

یہ نہ تھا کہ وہ کوئی زاہد خشک تھا‘ بلکہ دوستوں کے لیے تو وہ اکثر و بیشتر ایسی محفلیں سجواتا بھی تھا اور دوسروں کی جانب سے کیے گئے ایسے اہتمام میں شرکت بھی کیا کرتا تھا۔ لیکن یہاں معاملہ کچھ اور تھا‘ اس محفل میں اس کے والد گرامی ‘محترم رضا یاران بھی موجود تھے جن کی رنگین مزاجی سے وہ نہ صرف باخوبی واقف تھا‘ بلکہ اس کے لیے اتنے لوگوں کے درمیان ان کی حرکتیں برداشت کرنا ہمیشہ سے خاصا دشوار عمل رہا تھا۔ جب ہی وہ ان کے ساتھ ایسی کسی بھی نجی نوعیت کی دعوتوں میں جانے سے گریز کیا کرتا تھا۔ لیکن آج چونکہ رضا یاران کے بہت قریبی اور پرانے دوست نے اپنے نئے بنگلے میں اس پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی علی شیر کو شرکت کرنا پڑی تھی کہ خالد انکل نے اسے الگ سے فون کرکے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ اور جب وہاں کھانے کے بعد محفل سجائی گئی تو اس کا موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا۔ اور وہ جو وہاں سے نکلنے کا خواہش مند تھا‘ خالد انکل کے بیٹوں اور بھانجوں ‘بھتیجوں کے زور زبردستی کرنے پہ رکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

مگر اب وہ اپنے اس فیصلے پہ رہ رہ کے پچھتا رہا تھا اور جب اس کے ہوش و خرد سے بیگانہ باپ نے سامنے ناچتی ہوئی لڑکیوں میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ کے اسے ایک جھٹکے سے خود پہ گرا لیا تو علی شیر کا ضبط جواب دے گیا۔

ہاتھ میں پکڑا گلاس زمین پہ مارتے ہوئے وہ اگلے ہی لمحے اٹھ کر ہال سے باہر نکل گیا تھا۔

تازہ ہوا میں نکلنے کی خواہش میں اس نے بے چینی سے اپنے اردگرد دیکھا تھا۔ تب ہی اس کی نظریں اس بے حد کشادہ لابی کے دائیں جانب موجود زینے کی جانب اٹھی تھیں اور وہ بنا سوچے سمجھے تیز قدموں سے اوپر چل دیا تھا۔

فرسٹ فلور کو پار کرتا وہ مزید اوپر آگیا تھا‘ پہلی سیڑھیوں کے اختتام پہ موجود بند دروازے کو کھول کر جونہی اس نے ٹیرس پہ قدم رکھا ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اسے بے اختیار گہری سانس لینے پہ مجبور کر گیا۔

اردگرد پھیلے اندھیرے کی چادر میں ‘آسمان پہ چمکتے ستاروں اور گھروں میں جلتی روشنیوں نے افشاں سی بکھیر رکھی تھی۔ مگر اس کے اندر اماوس کی رات کا سا اندھیرا اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

سگریٹ کے دو تین لمبے کش لینے کے بعد ذہن پہ چھائی پراگندگی میں کچھ کمی واقع ہوئی تو تھکی تھکی سی سرخ نگاہیں اطراف میں بھٹکنے لگی تھیں۔ تبھی سڑک کے اس پار موجود بنگلے کا اندھیرے میں ڈوبا ٹیرس یک لخت روشنی میں نہا گیا تھا اور ایک نازک سا وجود نماز کے طریقے سے سر پہ دوپٹہ لپیٹے‘ ایک ہاتھ میں تسبیح پکڑے نمودار ہوا تھا۔

اردگرد سے بے نیاز وہ لڑکی زیر لب ورد کرتے ہوئے خاصی اندھیری چھت پہ کسی کی موجودگی سے مکمل طور پہ بے خبر تھی۔

اور علی شیر جو ابھی کچھ دیر پہلے عورت کو اپنی نسوانیت اور عزت محض چند ٹکوں کے عوض روندتا دیکھ کے آیا تھا‘ اس یکسر مختلف اور معطر روپ کو سامنے پا کے پلکیں تک جھپکنا بھول گیا تھا۔

وہ کوئی حور یا اپسرا نہ تھی مگر سبز دوپٹے کے ہالے میں لپٹا اس کا نرم گلابی چہرہ علی شیر کو اپنی زندگی میں آنے والے ہر حسین چہرے سے بڑھ کے لگا تھا۔ وہ اسے دیکھنے میں اس حد تک محو ہوا تھا کہ اسے اپنی انگلیوں میں دبی جلتی ہوئی سگریٹ بھی یاد نہ رہی تھی جو دھیرے دھیرے راکھ کا ڈھیر ہوتی اس کی انگلیوں تک آ پہنچی تھی۔

اپنے دھیان میں ٹہلتے ہوئے وجود نے چونک کر سر اٹھاتے ہوئے اپنے اردگرد دیکھا تھا۔ یوں جیسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ اس کے رک کر اپنے اطراف کا جائزہ لینے پہ علی شیر کی نظریں بھی دوبارہ اس کی طرف اٹھی تھیں جو اب ٹہلتے ہوئے ریلنگ کے پاس آکھڑی ہوئی تھی۔ جوں ہی لڑکی کو سامنے ایک مرد کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اس کے چہرے پہ ناگواری کے تاثرات بڑی تیزی سے ابھرے تھے۔ سرعت سے پیچھے ہٹتے ہوئے وہ پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ اور علی شیر کے دیکھتے ہی دیکھتے سامنے موجود چھت پہ ویرانی اور اندھیرا چھا گیا تھا۔

اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی وہ جو اب تک کسی خواب کی سی کیفیت میں گم صم سا کھڑا تھا‘ بے اختیار اک گہری سانس لیتا حقیقت میں لوٹ آیا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پہ اس کا دکھ اور تناؤ دونوں ہی مکمل طور پہ غائب ہو چکے تھے۔

نرم نرم سا ایک عجیب احساس اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ جس کے زیر اثر وہ سرشار سا خود بھی نیچے اتر کر باہر پورچ میں موجود اپنی گاڑی کی جانب چلا آیا تھا۔ اسے گاڑی اسٹارٹ کرتا دیکھ کے چوکیدار نے تیزی سے آگے بڑھ کے گیٹ کھولا۔ اگلے ہی لمحے اس کی سیاہ چمکتی ہوئی کرولا سڑک کے کنارے رکی تھی۔

دروازہ کھول کے وہ پیچھے کھڑے چوکیدار کی حیران نگاہوں کی پروا کیے بنا سامنے موجود بنگلے کے گیٹ کی جانب بڑھا تھا۔ جس پہ لگی ”فصیح الحسن“ کے نام کی نیم پلیٹ کو بغور پڑھتا ہوا واپس اپنی گاڑی میں آبیٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح ساڑھے بارہ بجے کے قریب آفس پہنچ کر علی شیر نے پہلا کام محمود کو فصیح الحسن نامی بندے کے متعلق پوری معلومات اکٹھی کرنے کے لیے کہا تھا اور خود وہ اپنے طے شدہ شیڈول کے مطابق گارڈز اور ڈرائیور کے ہمراہ یونیورسٹی روانہ ہو گیا تھا۔

داور اور مغیث کو ہمراہ لیے وہ اک شان بے نیازی سے چلتا ہوا وی سی کے آفس میں چلا آیا تھا۔ جہاں تھوڑی دیر بیٹھنے اور ہلکی پھلکی ریفریشمنٹ لینے کے بعد وہ ہمیشہ کی طرح صرف اپنی پارٹی کے بندوں کے ہمراہ یونیورسٹی کا چکر لگانے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔

”سر! آج تو صبح سے آصف میر اور اس کے بندے نظر ہی نہیں آئے۔“ اس کے برابر چلتے مغیث نے مسکراتے ہوئے کہا تو علی شیر کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”اچھا! تو پھر کیوں نہ چل کے اسے شرف ملاقات بخشا جائے۔“ وہ استہزائیہ انداز میں بولا تو اس کے ساتھ چلتے سب ہی لوگ مسکرا دیے۔

”چلیں سر!“ وہ لڑکوں کی راہنمائی میں آڈیٹوریم کے پیچھے موجود پرانی کلاسز کی جانب چلا آیا تھا جہاں آصف میر اپنا ڈیرہ جمایا کرتا تھا۔ اسے اس طرف آتا دیکھ کے بہت سی حیران نگاہیں ان کی طرف اٹھی تھیں اور کئی قدم تیزی سے اندر بیٹھے افراد کو مطلع کرنے کی غرض سے بڑھے تھے۔ جس کے نتیجے میں اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی آصف اپنے لڑکوں سمیت باہر آکھڑا ہوا تھا۔

”وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!

اپنے مخصوص باوقار انداز میں چلتا علی شیر اس کے قریب آرکا تو آصف میر نے کاٹ دار انداز میں شعر پڑھا اور بظاہر مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”میں تو سمجھا تھا کہ تم مجھے اپنے گھر کے گیٹ پہ ریسیو کرنے آؤ گے‘ لیکن جب مجھے پتا چلا کہ تم تو صبح سے گوشہ نشین ہو تو میں نے سوچا کیوں نہ میں خود ہی مزاج پرسی کر آؤں۔“ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے علی شیر نے بھی مسکرا کر اسے جتایا تو آصف میر کی مسکراہٹ سمٹ سی گئی۔ اس کے چہرے کے بدلتے تاثرات علی کو اندر تک مزا دے گئے تھے۔

"ویسے اب تک تو تمہیں اس سب کا عادی ہو جانا چاہیے۔" علی حظ اٹھانے والے انداز میں اس پہ زور دیتے ہوئے بولا تو آصف جلبلا کر بولا۔

"ہمارے ہاں تو طاقت اور پوزیشن کو ہمیشہ سے ہی سلام رہا ہے۔ تم لوگوں کے ڈر کو ان کا احترام سمجھنے کی غلطی مت کرو۔" علی نے گہری ہوتی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"تم اپنے دل کو ان ہی طفل تسلیوں سے بہلاؤ میں جب تک تمہارے گھر کے لیے کچھ کام کر لوں۔" وہ اک تمسخرانہ نظر اس پہ اور اس کے ساتھیوں پہ ڈالتا پیچھے پلٹا۔ ان کی صورتیں یک لخت اسے ایک نئی راہ سجھا گئی تھیں۔

"داور! تم کل ہی یونیورسٹی میں میری جانب سے ضرورت مند اسٹوڈنٹس کے لیے اسکالرشپس اناؤنس کر دو۔ باقی کی تفصیل میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

وہ انہیں مکمل طور پہ نظر انداز کیے آگے بڑھ گیا تو پیچھے کھڑے آصف میر کے پیروں سے لگی اور سر پہ جا بجھی۔

"الو کا پٹھا!" دانت پیستے ہوئے اس کی شرارے برساتی نظریں علی شیر کی چوڑی پشت پہ جمی تھیں۔

"میر! یہ تو بہت بڑا داؤ کھیل گیا ہے۔ پوری یونیورسٹی میں اس کے نام کے ڈنکے بج جائیں گے۔" اسد نے پریشانی سے آصف کا چہرہ دیکھا۔

"ڈنکے بجیں گے لیکن بدنامی کے' خود کو بڑی توپ چیز تصور کرتا ہے نا۔ اسے اب میں بتاؤں گا کہ سیاسی داؤ پیچ کہتے کسے ہیں۔" مٹھیاں بھینچے وہ منتقمانہ لہجے میں گویا ہوا تو اسد بے اختیار اک گہری سانس کھینچتے ہوئے اس نئی مشکل کا کوئی حل سوچنے لگا۔

☼ ☼ ☼

وہ اس وقت ہر شام کی طرح جم خانہ کے ٹینس کورٹ میں اپنے قریبی دوست [illegible]ن کے ساتھ تھا' گیم کھیلنے میں اس نے کبھی لاپروائی نہیں برتی تھی۔ جب ہی اس کی صحت قابل رشک اور [illegible]م بے حد مضبوط تھا۔ اس پہ مستزاد اس کا چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد' چوڑی پیشانی' ارادوں کی طرح اٹل کھڑی ناک اور مغرور آنکھیں' دیکھنے والوں کو ایک لمحے کے لیے اپنے سحر میں گرفتار کر لیا کرتی تھیں۔ مگر وہ شان استغنا کے ساتھ آگے بڑھ جانے کا عادی رہا تھا۔ لیکن اس بار نجانے کیا ہوا تھا کہ باوجود آج کی بے تحاشا مصروفیت کے وہ خود کو کل رات کے سحر سے نکال نہیں پایا تھا۔

لاشعوری طور پہ اس لڑکی کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ بے چینی سے محمود کی کال کا منتظر تھا' جب معاً "سائیڈ لائن" پہ کھڑے اس کے ملازم نے اس کا موبائل فون اس کی جانب بڑھاتے ہوئے انتظار کی کوفت سے اسے نجات دلائی تھی۔

"ہاں بولو محمود!" وہ اپنی بے ترتیب سانس کے ساتھ ملازم کے ہاتھ سے تولیہ لیتا چیئر پہ آ کے گر سا گیا۔

"سر! فصیح الحسن مشہور کنسٹرکشن کمپنی "حسن بلڈرز" کے مالک ہیں۔ ان کے دو بھائی آرمی میں جبکہ ایک بھائی لندن میں ہوتے ہیں۔ بہن کوئی نہیں ہے۔ ایک بیٹی' علینہ اور ایک بیٹا عمر ہے۔ بیٹی ان کی یونیورسٹی میں پڑھتی ہے جبکہ بیٹا ابھی انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے انگلینڈ گیا ہے۔ انکم ٹیکس اور بینک اکاؤنٹس کی ڈیٹیل میں صبح آفس۔"

"بیٹی کس یونیورسٹی میں پڑھتی ہے؟"

علینہ نام ذہن میں دہراتے ہوئے اسے ٹوک دیا تو تیزی سے تفصیل سناتا محمود ایک پل کے لیے رک گیا۔ معاملے کی نوعیت اسے اب سمجھ میں آئی تھی جبکہ اس نے تو فصیح الحسن کی فیملی کے متعلق سرسری اور آفیشل انفارمیشن ڈیٹیل میں اکٹھی کی تھی۔

"سر! یہ تو میں نے نہیں پتا کروایا۔" وہ جھجکتے ہوئے بولا تو علی شیر کے چہرے پہ بے زاری چھا گئی۔ لیکن چونکہ وہ جانتا تھا کہ محمود کی اس میں کوئی غلطی نہ تھی۔ اس لیے وہ اس پہ بگڑنے کے بجائے تحمل سے بولا۔

"واٹس او کے۔"

"سر! کل تک آپ کو اس کے بارے میں پوری انفارمیشن مل جائے گی۔"

وہ اگلے ہی پل مستعدی سے بولا تو علی شیر نے ہاتھ میں پکڑا تولیہ کوفت سے میز پہ پھینک دیا۔ اس کی اس حرکت پہ اس کے برابر کرسی سنبھالتے محسن نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ جس کا موڈ چند لمحے پیشتر کے برعکس خاصا آف لگ رہا تھا۔

"فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔" نجانے کیوں اسے یکایک اپنی اس درجہ اضطرابی کیفیت سے ہی الجھن ہونے لگی تھی۔ آخر وہ اتنا مضطرب کیوں ہو رہا تھا؟

"اب ایسی بھی کوئی دنیا سے ماورا چیز نہیں تھی۔" کسی نے اسے سختی سے باور کروایا تو وہ کل رات کی اپنی اس کیفیت کو پیچھے دھکیلتا ایک بار پھر وہی علی شیر باران بننے کی کوشش کرنے لگا جس نے ہمیشہ اپنے لیے دلوں کو فرش راہ ہوتے دیکھا تھا۔ اور جو خود سے صنف مخالف پہ نگاہ غلط ڈالنا بھی اپنی توہین تصور کرتا تھا۔

"جیسے آپ کہیں۔" اس کے جواب پہ محمود فقط اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

"اور سر فصیح الحسن کے متعلق انفارمیشن؟"

"اسے بھی رہنے دو۔" وہ بے تاثر سے لہجے میں بولا تو حیران سا محمود ایک پل کے لیے خاموش ہو گیا۔

کہاں تو وہ صبح تک ساری معلومات فوری اکٹھی کرنے کے لیے کہہ رہا تھا اور کہاں اب سرے سے ہی منع کر رہا تھا۔

"اوکے سر!" تابع داری سے کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر ڈالا تو علی نے بھی ہاتھ میں پکڑا فون بے دلی سے میز پہ ڈال دیا۔ یہ اچانک اسے ہوا کیا تھا وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

☼ ☼ ☼

آنے والے دنوں میں علی شیر باران کی جانب سے تشہیر ہونے والی اسکالرشپس کا چرچا پوری یونیورسٹی میں ہونے لگا تھا۔ اس کی ذات یکایک ان اسٹوڈنٹس کے درمیان بھی مشہور ہو گئی تھی۔ جو یونیورسٹی صرف پڑھائی کی غرض سے آتے تھے اور جن کا کسی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

ایسے میں آصف میر اور اس کے کارکنوں کی جھنجلاہٹ اور غصہ کافی حد تک بڑھ گیا تھا' جس کی وجہ سے یونیورسٹی کے ماحول میں پچھلے کچھ دنوں سے خاصی کشیدگی در آئی تھی۔

چھوٹی سی بات بھی ایک بڑے ہنگامے کا سبب بن سکتی تھی اور آج کیفے ٹیریا میں یہی ہوا تھا۔ جب ایک معمولی سی بات پہ دونوں پارٹیوں کے بندوں نے دست و گریباں ہونے میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔ ایسے میں کس نے فائرنگ شروع کی اور کس نے پتھر اٹھایا۔ کچھ پتا نہیں چلا تھا' ہاں لیکن برپا ہونے والے ہنگامے نے اسٹوڈنٹس کو ہراساں ہو کے بھاگنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"آپ لوگ سامنے سے نہیں' لائبریری کی طرف سے نکلیں۔ باہر پتھراؤ ہو رہا ہے۔" وہ ساری کلاس فیلوز بھاگتے ہوئے ڈپارٹمنٹ کے مین دروازے کی جانب جا رہی تھیں جب دوسری جانب سے چند لڑکے دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔

ان کی بات پہ روہانسی ہوتی وہ سب ڈپارٹمنٹ کے پچھلے دروازے کی جانب لپکی تھیں جو لائبریری کی طرف کھلتا تھا۔

مگر باہر نکل کے انہیں احساس ہوا تھا کہ ان برستے پتھروں میں گیٹ تک پہنچنا تو دور وہ لائبریری کا وسیع و عریض لان ہی عبور کر لیتیں تو بڑی بات تھی۔

"یا اللہ ہم کیا کریں؟" روہانسی ہوتی ناجیہ نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا تو سب کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

بے بسی کی تصویر بنی وہ سب اپنے ڈپارٹمنٹ کے پچھلے برآمدے میں کھڑی دور برپا حشر کو متفکر نگاہوں سے دیکھتی ہول رہی تھیں۔ جب فضا میں سائرن کی آوازیں گونجتی سنائی دی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ارد گرد برستے پتھر جیسے تھم سے گئے تھے۔ لیکن بھاگتے قدموں میں اچانک اضافہ ہو گیا تھا۔

"چلو جلدی نکلو۔" ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ان چاروں نے بھی باقی لڑکیوں کے ساتھ سامنے کی جانب دوڑ لگا دی تھی۔ لائبریری کا لان عبور کر کے وہ سب اب مین گراؤنڈ کے اردگرد بنی چوڑی سی سڑک پہ آ پہنچی تھیں، جس کے انتہائی سرے پہ واقع پارکنگ لاٹ سے متصل گیٹ کے اردگرد بے پناہ رش کے درمیان پولیس موبائلز دور سے ہی کھڑی نظر آرہی تھیں۔

لوگوں کے درمیان بمشکل جگہ بناتے ہوئے وہ تیز قدموں سے وی سی کے آفس تک پہنچی ہی تھیں کہ نجانے کہاں سے ایک پتھر اڑتا ہوا آکر علینہ کے سر پہ لگا تھا اور وہ "سی" کی آواز کے ساتھ بے اختیار سر تھام کے نیچے بیٹھتی چلی گئی تھی۔

"علینہ!" ملیحہ کی چیخ پہ نہ صرف وہ تینوں بلکہ اردگرد موجود لوگ اور وی سی کے ساتھ آفس سے نکلتے علی شیر نے بھی چونک کر سامنے دیکھا تھا۔ جہاں زمین پہ ایک لڑکی کو سر پکڑے بیٹھا دیکھ کر وہ تیزی سے سامنے کی تین چار سیڑھیاں عبور کرتا نیچے اترا تھا۔

اسے آتا دیکھ کر سب ہی از خود اس کے راستے سے پیچھے ہٹے تھے۔

"ایکسکیوزمی مس! آپ ٹھیک تو ہیں؟" زخمی لڑکی کے پاس پہنچتے پہ اس نے متفکر نظروں سے اس کے جھکے سر کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا، جس کی سہیلیاں اسے تھامے بیٹھی تھیں۔

"پ، پانی۔" وہ بمشکل تمام بولی تو علی شیر نے پلٹ کر با آواز بلند کسی کو آفس سے پانی لانے کے لیے کہا تھا۔ پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے ملیحہ نے اس کا چہرہ اونچا کیا تھا اور علی شیر بری طرح چونک گیا تھا۔ زرد چہرے اور بہتے اشکوں کے ساتھ زمین پہ نڈھال گری لڑکی، علینہ فصیح ہوگی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

"اس کے سر سے تو خون بہہ رہا ہے۔" اس کا سر اپنے بازو پہ ٹکائے بیٹھی ثمین نے اس کے بالوں کو گیلا محسوس کرتے ہوئے ہاتھ سے چھو کر دیکھا تو اس کی انگلیوں پہ خون لگ گیا۔

"او گاڈ!" ثمین کی بات پہ ناجیہ بے اختیار رو پڑی تھی جبکہ علی شیر نے تیزی سے جیب میں پڑا موبائل نکالتے ہوئے نمبر ملایا۔

"گاڑی کہاں ہے؟" چھوٹتے ساتھ ہی اس نے دوسری طرف موجود بندے سے استفسار کیا۔

"گاڑی وی سی کے دفتر کے جتنا ہو سکے قریب لے آؤ۔ کسی کو ہاسپٹل لے کے جانا ہے۔" اس نے ڈرائیور کو ہدایت دیتے ہوئے فون بند کیا۔

"آپ لوگ پریشان مت ہوں، ہم ابھی انہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔" وہ ان تینوں کو تسلی دیتے ہوئے بولا تو ثمین نے الجھ کر سامنے بیٹھی ملیحہ کی جانب دیکھا۔

"لیکن آپ ہیں کون؟" ثمین نے ملیحہ کے چہرے سے نگاہیں اٹھاتے ہوئے سامنے کھڑے اجنبی کی طرف دیکھا۔

"علی شیر یاران۔" اور ان تینوں نے بے اختیار ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا۔ مگر چونکہ فی الحال اور کوئی راستہ نہ تھا اور نہ ہی علینہ کا خون رکنے کا نام لے رہا تھا۔ اس لیے وہ تینوں آنکھیں بند کیے پڑی علینہ کو بمشکل سنبھالتی اس کی لینڈ کروزر تک چلی آئی تھیں۔ جو اس رش میں یہاں تک کیسے پہنچی تھی، وہ حیران تھیں۔ جبکہ پیچھے کھڑی اوپن جیپ میں اسلحے سے لیس باوردی گارڈز کو دیکھ کے وہ گھبرا گئی تھیں۔

"آپ مجھ پہ ٹرسٹ کر سکتی ہیں۔" ان کے چہروں پہ بکھرے تذبذب کو دیکھتے ہوئے علی شیر نے رسان سے کہا تو وہ ایک نظر اس کے چہرے پہ ڈالتی گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ اس کے پسنجر سیٹ پہ بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھائی تھی اور سامنے موجود لوگ راستے سے یوں ہٹے تھے گویا کسی شہزادے کی سواری کے آگے سے رعایا ہٹتی ہے۔ بے اختیار ان تینوں کی نظریں ایک دوسرے کی جانب اٹھی تھیں۔

"شہزادہ جان عالم نے یہ مہربانی ان پہ کیوں کی تھی؟" ہول کر سوچتے ہوئے ثمین نے دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"تمہیں علی شیر یاران ہاسپٹل لے کے گیا تھا؟" سب کے کمرے سے نکلتے ہی اسد نے سرد نگاہوں سے بیڈ پہ تکیوں کے سہارے نیم دراز علینہ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

وہ اپنی فیملی کے ساتھ اس کی عیادت کے لیے ان کے گھر آیا ہوا تھا۔ اس کے سر میں چھ ٹانکے آئے تھے۔

ثمین نے اسپتال پہنچتے ہی فصیح صاحب کو فون کر کے فوراً پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ اس دوران سارا ٹریٹمنٹ علی شیر نے خود اپنی نگرانی میں کروایا تھا۔ جس پہ فصیح الحسن اس کے بے حد شکر گزار ہوئے تھے۔

اسپتال سے فراغت کے بعد وہ ان چاروں کو لیے گھر چلے آئے تھے جہاں علینہ تو دواؤں کے زیر اثر سو گئی تھی۔ لیکن وہ تینوں اس کے کمرے میں بیٹھی دیر تک آج کے واقعے اور علی شیر یاران کو ڈسکس کرتی رہی تھیں۔ وہ حقیقتاً "اتنا خدا ترس تھا یا ہمارے ہاں کے اسی فیصد مردوں کی طرح اس کی رحم دلی محض لڑکیوں کو دیکھ کر جاگی تھی" وہ سمجھنے سے قاصر تھیں۔

بہرحال شام کی چائے سے فراغت کے بعد وہ تینوں ڈرائیور کے ہمراہ اپنے گھروں کی جانب روانہ ہو گئی تھیں۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی اکبر اعوان اپنی پوری فیملی کے ساتھ چلے آئے تھے۔ علینہ کے زخمی ہونے کی خبر انہیں اسد نے دی تھی، جس کے علم میں خود یہ ساری بات چار بجے کے قریب اپنے ایک دوست کے ذریعے آئی تھی اور وہ تب سے لے کر اب تک اپنا ڈھیروں خون جلا چکا تھا۔

"جی۔" اس کے چہرے پہ چھائی ناراضی کو تکتے ہوئے وہ آہستگی سے بولی تو وہ کاؤچ پہ مکا مارتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم مر رہی تھیں کیا جو صبر نہیں کر سکتی تھیں؟"

"اسد!" اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"میں، میں خود تو نہیں گئی تھی۔ بلکہ ثمین بتا رہی تھی کہ وہ لوگ بھی یوں ایک انجان آدمی کے ساتھ کبھی نہ جاتیں اگر جو حالات اتنے خراب نہ ہوتے۔"

"حالات ہمیشہ کے لیے تو خراب نہیں ہوئے تھے، تھوڑی دیر میں سنبھل ہی جاتے۔ تم اکیلی تو زخمی نہیں ہوئی تھیں ناں۔" وہ اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی کی پروا کیے بنا اسی لہجے میں اسے گھورتے ہوئے بولا تو آنسو بے اختیار اس کے گالوں پہ پھسل آئے۔

"پوری پارٹی کے سامنے تم نے مجھے منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا اور میری تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ پوری یونیورسٹی میں اسے صرف تم ملی تھیں مدد کرنے کے لیے؟ باقی زخمی اس الو کے پٹھے کو کیوں نظر نہیں آئے؟" وہ دانت پیستے ہوئے بولا تو علینہ کا ضبط بھی جیسے جواب دے گیا۔

"یہ آپ مجھ سے پوچھنے کے بجائے الو کے پٹھے سے کیوں نہیں پوچھتے نا؟"

"شٹ اپ! پتا بھی ہے کس قدر کرپٹ آدمی ہے وہ؟" وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں اور نہ ہی مجھے اس کے کیریکٹر کے بارے میں جاننے کا کوئی شوق ہے۔ میں اس کے ساتھ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ بحالت مجبوری لے جائی گئی تھی۔ اگر اتنی ہی پروا تھی میری تو جب ہنگامہ شروع ہوا تھا تو آپ سب سے پہلے مجھے وہاں سے نکالنے کی کرتے مگر آپ نے میری مدد تو دور مجھے ایک فون تک کرنے کی زحمت نہیں کی۔ کیا میں آپ کی ذمہ داری نہیں تھی؟"

فہمائشی نظروں سے اس کی جانب دیکھتے وہ سخت لہجے میں بولی تو مقابل کھڑا اسد شرمندہ سا ہو گیا۔

"میں نے آپ کی ہر غلطی کو ہمیشہ اگنور اور ہر مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اسد! پھر آج آپ کیوں میری مجبوری کو انڈر اسٹینڈ نہیں کر رہے؟ کیوں نہیں یہ سمجھ رہے کہ آج جو کچھ بھی ہوا وہ محض ایک اتفاق تھا۔ جس کی وجہ سے آپ کو کسی کے سامنے شرمندہ یا جوابدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" بولتے ہوئے اس کا لہجہ آخر میں دھیما پڑ گیا تو اسد اک گہری

سانس لیتا بیڈ کی پائنتی کے پاس بیٹھ گیا۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے اس بارے میں اتنا اگریسو ہو کے نہیں سوچنا چاہیے۔ رہی بات یونیورسٹی کی تو میں اس وقت میرے ساتھ۔۔۔"

نرم لہجے میں بولتا وہ ہمیشہ کی طرح اپنے مسئلے اپنی توجیہات بیان کرنے لگا تھا اور سر جھکائے افسردہ سی علینہ یہ سوچنے پہ مجبور ہو گئی تھی کہ اسد اعوان کی ترجیحات کی فہرست میں اس کا نام کب اول نمبر پہ آئے گا؟

☼ ☼ ☼

اگلی صبح وہ سو کے اٹھی تو سر میں درد خاصا کم تھا۔ رات بھر جو حرارت رہی تھی وہ بھی اس وقت نہیں تھی۔ گھڑی پہ نگاہ ڈالتے وہ آہستگی سے اٹھ کے باتھ روم کی جانب چل دی تھی۔

منہ ہاتھ دھو کے وہ باہر آئی تو صوفیہ بیگم بیڈ شیٹ ٹھیک کر رہی تھیں۔

"میں تمہیں ہی دیکھنے آئی تھی۔ کیسی طبیعت ہے؟" وہ ہاتھ میں پکڑا تکیہ جگہ پہ رکھتی اس کے قریب چلی آئیں۔ "شکر ہے بخار تو اترا۔" اس کی پیشانی چھوتے ہوئے انہوں نے اطمینان بھرا سانس لیا۔

"زخم میں درد تو نہیں؟" انہوں نے متفکر نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا تو علینہ ان کے خود ہی سوال جواب کرنے پہ مسکرا دی تھی۔

اس کی ماں کل سے کتنی پریشان تھیں، وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ رات بھی وہ اس کے پاس سوئی تھیں۔ اور ذرا سی آہٹ پہ دس بار اٹھ کے بیٹھی تھیں۔ جبکہ اگلے نے کتنے آرام سے اسے مرنے کا طعنہ دے دیا تھا۔

"نہیں اور اب آپ بھی پریشان مت ہوں، میں کافی بہتر محسوس کر رہی ہوں۔" وہ بے اختیار ان کا ہاتھ تھام گئی تو صوفیہ نے اسے سینے سے لگا لیا۔

لوشن ہاتھ پہ ڈالے وہ چہرے پہ لگاتی آئینے میں اپنے سر پہ بندھی پٹی کو دیکھ رہی تھی جب سائیڈ ٹیبل پر رکھا اس کا موبائل بجنے لگا۔

آگے بڑھ کے اس نے موبائل اٹھاتے ہوئے اسکرین پہ نگاہ ڈالی تھی۔ جہاں ایک انجانا نمبر جگمگا رہا تھا۔

"ہیلو۔" کال ریسیو کرتے ہوئے اس نے دھیرے سے کہا۔

"علینہ فصیح بات کر رہی ہیں؟" دوسری جانب سے ایک بھاری انجانا لہجہ ابھرا تو علینہ کے چہرے پر الجھن در آئی۔

"جی، لیکن آپ کون؟"

"میں علی شیر یاران بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف سے اپنا تعارف کروایا گیا تو علینہ اپنی جگہ پہ تھم سی گئی۔

"آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟" اس کی کیفیت سے بے نیاز مقابل نے انتہائی نارمل لہجے میں استفسار کیا تو ایک لمحے کے لیے علینہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا ہے۔

"جی ٹھیک ہے، لیکن آپ کے پاس میرا نمبر کہاں سے آیا؟" دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے بظاہر اعتماد سے پوچھا۔ ذہن میں یک لخت ہی اسد کی باتیں گھومنے لگی تھیں۔

"آپ کی فرینڈ سے لیا تھا۔" نجانے کیوں علینہ کو اس کی آواز مسکراتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"میری فرینڈ؟" بے یقینی اس کے چہرے پر ہی نہیں بلکہ لہجے میں بھی در آئی تھی۔ اس کی اجازت کے بغیر وہ تینوں یہ حرکت کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ لیکن پھر اس شخص کے پاس نمبر آیا کہاں سے تھا؟

"کیوں آپ کو میرا فون کرنا اچھا نہیں لگا؟" وہ اسی نارمل لہجے میں بولا تو علینہ اک گہری سانس لیتی ہمت مجتمع کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے کسی بھی اجنبی کا فون کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

"لیکن ہم اجنبی تو نہیں۔" اس کے انداز میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔

"اگر آپ کی مراد کل کے واقعہ سے ہے تو وہ محض ایک اتفاق تھا۔ آپ مجھے زخمی حالت میں ازراہ ہمدردی ہسپتال لے گئے جس کے لیے میں آپ کی ممنون ہوں۔ اس سے زیادہ نہ آپ میرے بارے میں جانتے ہیں اور نہ میں آپ کے، سو ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی کہلائیں گے۔"

وہ شائستگی لیکن قدرے سختی سے گویا ہوئی۔

"لیکن اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ کے بارے میں بہت کچھ اور کافی پہلے سے جانتا ہوں تو؟"

"تو معذرت کے ساتھ میں یہ کہوں گی کہ آپ کو غیر لڑکیوں کے بارے میں انفارمیشن اکٹھی کرتے ہوئے شرم آنا چاہیے۔" وہ اس کا احسان ایک طرف رکھتے ہوئے غصے سے بولی تو علی شیر بے اختیار ہنس دیا۔

"مجھے آپ سے اسی جواب کی امید تھی۔ اینی وے اپنا خیال رکھیے گا، اللہ حافظ!" نرمی سے کہتا وہ فون بند کر گیا تو ساکت علینہ اس عجیب و غریب کال پہ حیران پریشان ہوتی بیڈ پہ بیٹھ گئی۔

وہ بندہ اس کے بارے میں بہت کچھ اور کافی عرصے سے جانتا تھا؟

"یا اللہ! یہ کیا نئی مصیبت گلے پڑ گئی ہے۔" سوچتے ہوئے اس نے بے اختیار اپنی پیشانی مسلی۔

"اور اگر جو اس نے یہی بکواس اسد سے کر دی تو؟" اور اس "تو" کے آگے اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بلکہ اسے تو اب کل کا اتفاق بھی اتفاق نہیں لگ رہا تھا۔ واقعی کل اسے صرف ایک وہی ملی تھی ہسپتال لے جانے کو اور بھی تو کتنے لڑکے لڑکیاں زخمی ہوئے تھے۔ وہ باقیوں کو کیوں نہ اپنی گاڑی میں ہسپتال لے گیا؟

یکایک اسے اسد کی بات صحیح لگنے لگی تھی۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ اگر اس نے دوبارہ رابطہ کیا تو اس نئی مشکل سے وہ کیسے نبٹے گی؟

☼ ☼ ☼

ہونٹوں پہ محظوظ مسکراہٹ لیے علی شیر نے فون بند کرتے ہوئے چند لمحے پہلے علینہ فصیح سے ہوئی گفتگو کو ذہن میں دہرایا تھا اور اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ علینہ فصیح اس کے اردگرد موجود ڈھیروں لڑکیوں میں منفرد تھی۔ جس کی ایک اپنی باوقار اور الگ شخصیت تھی اور علی شیر یاران جیسے شان دار اور مختلف بندے کو اچھوتی اور منفرد چیزیں ہمیشہ سے ہی بے حد متاثر کیا کرتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا تمہیں علی شیر یاران نے فون کیا تھا؟" وہ تینوں اس کا حال معلوم کرنے علینہ کی طرف آئی ہوئی تھیں، جب اس نے انہیں گزشتہ روز آنے والی علی شیر کی کال کے متعلق بتاتے ہوئے ابھی بات شروع بھی نہیں کی تھی کہ حیرت زدہ سی ثمین بے اختیار چلا اٹھی تھی۔

"مگر اس کے پاس تمہارا نمبر آیا کہاں سے؟" ملیحہ کے تاثرات بھی کم و بیش ثمین جیسے ہی تھے۔ حیرت اور پریشانی میں ڈوبے۔ جبکہ نادیہ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ لبوں سے لگانا بھول گئی تھی۔

"بقول اس کے اس نے میرا نمبر میری فرینڈ سے لیا تھا۔" علینہ نے انہیں دیکھتے ہوئے مطلع کیا تو تینوں اچھل ہی پڑیں۔

"تم نے کیا ہمیں اتنا بے وقوف اور غیر ذمہ دار سمجھ رکھا ہے کہ ہم تمہارا نمبر ہرایرے غیرے کو تھماتے پھریں گے؟" ثمین جلبلا کر بولی تو علینہ بے اختیار اک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔

"مجھے پتا ہے یار! کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔ لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ میرے بارے میں بہت کچھ اور کافی عرصے سے جانتا ہے۔"

"کیا؟" اس نئی اطلاع نے تو صحیح معنوں میں ان تینوں کی سٹی گم کر دی تھی۔

"مجھے تو سوچ سوچ کر پریشانی ہو رہی ہے کہ وہ میرے بارے میں کیوں اور کس لیے انفارمیشن اکٹھی

کرتا پھر رہا ہے؟ جبکہ میں نے تو اسے صحیح سے دیکھا تک نہیں۔“

”ویسے دیکھ لیتیں تو اتنا ملال نہیں ہوتا۔“ یک لخت ناجیہ کی زبان میں کھجلی ہوئی تو تینوں بے ساختہ ہی مسکرا دیں۔

”بکو مت!“ ملیحہ نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے گھورا تو ناجیہ ہاتھ میں پکڑا کپ نیچے رکھتے ہوئے جوش سے بولی۔

”قسم سے علینہ میں نے اتنا ہینڈسم بندہ اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اوپر سے کیا شان کیا انداز ہے اس کا۔ پورا ہاسپٹل کا اسٹاف اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا اور وہ تھا کہ کسی کو لفٹ ہی نہیں کروا رہا تھا۔“

”ہی۔ بالکل یہی بات میں نے بھی گاڑی میں بیٹھتے ساتھ ہی محسوس کی تھی۔ اور میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس جیسے شخص نے ہماری مدد کیوں کی تھی؟ واپس آکر بھی ہم نے اس کی ہمدردی کو ڈسکس کیا تھا‘ مگر وجہ نہیں سمجھ سکے تھے۔“ ثمین نے پریشانی سے کہا۔ تو علینہ کی الجھن دوچند ہو گئی۔

”یہ کس مشکل میں گرفتار ہو گئی ہوں میں۔ پتا ہے اسد کہہ رہے تھے کہ انتہائی کرپٹ آدمی ہے وہ۔“

”اللہ رحم کرے۔ ویسے تم نے اس بات کا اسد سے ذکر کیا؟“ ملیحہ نے اس کی جانب پریشان نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں یار! وہ تو پہلے ہی اتنا ناراض ہو رہے تھے کہ ہم اس کے ساتھ ہسپتال کیوں گئے۔“ وہ متفکر لہجے میں بولی تو ثمین خفگی سے گویا ہوئی۔

”نہیں خیر‘ یہ بات تو وہ غلط کہہ رہا ہے۔ ہم کوئی خوشی سے اس کے ساتھ تھوڑا ہی گئے تھے۔ اگر ہمارے پاس کوئی اور آپشن ہوتا تو ہم بھلا کیوں ایک اجنبی کا احسان لیتے۔“

”صحیح کہہ رہی ہے ثمین۔ اس وقت تمہاری جو حالت تھی میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے تمہارا خون دیکھ کے۔“ ناجیہ نے یاد کرتے ہوئے بے اختیار جھرجھری لی۔ تو علینہ اک بوجھل سانس لے کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی میں ہونے والی ہنگامہ آرائی کے نتیجے میں اگلے دو دن یونیورسٹی بند رہی تھی۔ تمام آفیشلز نے‘ سیاست کے نام پہ آئے دن ہونے والے ان جھگڑوں اور تعلیم کو پہنچنے والے نقصان کے خلاف وائس چانسلر کو سخت ایکشن لینے کے لیے کہا تھا اور یوں وہ دونوں پارٹیوں کے اہم کارکنوں کو اپنے آفس میں بلانے پہ مجبور ہو گئے تھے۔

”ایکسکیوزمی سر! اگر علی شیر اس معاملے میں اتنے ہی حساس ہو رہے ہیں تو انہوں نے خود یہاں آنے کی زحمت کیوں نہیں کی؟“ آصف میر نے طنزیہ نظروں سے وی سی کو دیکھتے ہوئے ٹوک دیا۔

”اس لیے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی موجودگی ہماری کارروائی پہ کسی بھی طرح سے اثر انداز ہو۔“ وی سی نے اسے کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

ان کا جواب داور اور مغیث کے لبوں پہ محظوظ سی مسکراہٹ بکھیر گیا تھا‘ جسے اسد اعوان نے کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے رخ موڑ لیا۔

”یعنی آپ مانتے ہیں کہ ان کی موجودگی آپ کے فیصلوں پہ اثر انداز ہوتی ہے؟“ آصف میر چبھتے ہوئے لہجے میں بولا تو وی سی اپنی جگہ پہ جز بز سے ہوتے ایک نظر ٹیبل کے دوسری جانب بیٹھے آصف کو محض دیکھ کر رہ گئے۔ جس کے لبوں پہ کھیلتی طنزیہ مسکراہٹ انہیں سلگا گئی تھی۔ مگر وہ چاہ کر بھی اسے کچھ زیادہ نہ کہہ سکتے تھے۔

اسے جن ہستیوں کی پشت پناہی حاصل تھی‘ وہ کوئی معمولی لوگ نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یونیورسٹی سے کتنے سال پہلے پاس آؤٹ ہو جانے کے بعد بھی یہاں نہ صرف دندناتا پھرتا تھا بلکہ انتہائی سکون سے یہاں بیٹھ کر اپنی پارٹی کا یوتھ ونگ بھی چلا رہا تھا۔

”اثر انداز تو اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ وگرنہ جو

تماشا آپ لوگوں نے یونیورسٹی میں لگا رکھا ہے‘ اس کے بعد تو اصولاً آپ لوگوں کو میرے آفس میں نہیں بلکہ یونیورسٹی کے گیٹ سے باہر ہونا چاہیے۔“ انہوں نے ایک جتاتی نظر آصف کے چہرے پہ ڈالتے ہوئے باقی تینوں لڑکوں کو بھی فہمائشی نظروں سے دیکھا۔

”سر! دو دن پہلے جو کچھ بھی ہوا اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں۔ ان فیکٹ ہم تو پچھلے کتنے ہی دنوں سے باران صاحب کی جانب سے اناؤنس ہونے والی اسکالر شپ کے سلسلے میں مصروف ہیں۔ لیکن جس دن سے اسکالر شپس کی اناؤنسمنٹ ہوئی ہے اس روز سے ہی یہ لوگ نہ صرف لڑائی کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں بلکہ ان کی پوری کوشش ہے کہ کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ رک جائے۔“ داور نے مقابل بیٹھے وی سی کی جانب دیکھتے ہوئے صفائی دی۔

”ہونہہ! ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم ان کے کسی سلسلے میں رکاوٹیں کھڑی کریں۔ یہ لوگ اب خود اپنے اس ڈرامے کو ختم کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔“ آصف نے استہزائیہ انداز میں ہنکارا بھرتے ہوئے کندھے اچکائے تو داور نے ایک جھٹکے سے رخ موڑتے ہوئے خود سے ذرا فاصلے پہ کرسی سنبھالے بیٹھے آصف پہ ایک سلگتی ہوئی نگاہ ڈالی۔

”ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا کہ کون کیا کر رہا ہے۔ اور کیا نہیں۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ آپ لوگوں کی عداوت کی وجہ سے ہمارے ادارے کا نہ صرف نام بدنام ہو رہا ہے بلکہ طلبہ کا قیمتی وقت بھی برباد ہو رہا ہے۔ آپ لوگوں کی غیر ذمہ داری کی وجہ سے نہ صرف یونیورسٹی کی املاک کو نقصان پہنچا بلکہ کتنے ہی طلبہ زخمی بھی ہوئے۔ خدا نخواستہ اس روز اگر کوئی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا تو آپ بتائیں ہم ان کے والدین کو کیا جواب دیتے؟“

وی سی نے غصے سے ٹیبل پہ ہاتھ مارتے ہوئے ان کو گھورا تو بے اختیار وہ نظریں چرا گئے۔

”ہماری برداشت اب جواب دے گئی ہے۔ اور یہ ہم سب کا مشترکہ فیصلہ ہے کہ اگر آپ لوگوں نے اپنے رویے تبدیل نہ کیے تو ہم سب مل کر آپ کے خلاف ایکشن لیں گے پھر چاہے ہمیں اپنی کرسیوں سے کیوں نہ ہاتھ دھونے پڑ جائیں!“ انگلی اٹھائے انہوں نے انتہائی سخت لہجے میں انہیں وارن کیا۔

”سر! ہماری طرف سے آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ لیکن آپ پلیز ان لوگوں سے کہیں کہ یہ اپنے کام سے کام رکھیں۔“

مغیث نے بنا آصف اور اسد کی طرف دیکھے ہاتھ سے ان کی طرف اشارہ کیا تو وی سی کی غصیلی نگاہیں بے اختیار آصف میر کی جانب اٹھ گئیں۔

”آپ لوگوں کو یہ میری لاسٹ وارننگ ہے۔ ورنہ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ مجھے آپ لوگوں کی سرگرمیوں کو یونیورسٹی سے باہر تک محدود کرنا پڑے گا۔“ ان کی بات جہاں کمرے میں موجود ہر فرد کو حیران کر گئی تھی وہیں آصف میر کا چہرہ بھی تیزی سے سرخ ہو گیا تھا۔

”بہت بڑی بات کہہ گئے ہیں آپ۔“ ان کے چہرے پہ نگاہیں جمائے وہ انتہائی سرد لہجے میں بولا تو وی سی صاحب اثبات میں سر ہلا گئے۔

”میں جانتا ہوں۔ اور میری یہ وارننگ صرف تمہارے لیے نہیں بلکہ ہر اس شخص کے لیے ہے جو اب ہمارے فیصلے سے روگردانی کرے گا۔“ وہ بنا کسی ہچکچاہٹ کے واضح الفاظ میں بولے تو چند لمحے بغور ان کی جانب دیکھنے کے بعد آصف جب بولا تو حیران کن طور پہ اس کا لہجہ نرمی لیے ہوئے تھا۔

”ٹھیک ہے! آپ کو ہماری طرف سے بھی کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ لیکن اپنی اس وارننگ پہ اب آپ قائم رہیے گا۔“

آنکھوں میں عجیب سی چمک لیے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تو اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرتا اسد اعوان بھی اٹھ گیا۔ جبکہ مغیث اور داور نے بے اختیار ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

ناجیہ کی بڑی بہن کی منگنی تھی۔ فنکشن شہر کے بہترین ہوٹلوں میں سے ایک میں ارینج کیا گیا تھا۔ وہ تینوں بھی اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ مدعو تھیں۔

علینہ شیفون کی آف وائٹ لانگ شرٹ، جس کے بازوؤں اور گلے پہ موتیوں اور نگینوں کا بے حد نفیس کام بنا ہوا تھا، کے ساتھ آف وائٹ، سلک کا پاجامہ پہنے، کانوں میں کندن کے آویزے ڈالے اپنے ڈرائی کیے بالوں اور مناسب میک اپ کے ساتھ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ چونکہ ان چاروں سہیلیوں کی فیملیز کا بھی آپس میں ملنا جلنا تھا اس لیے فنکشن میں وہ تینوں ہر جگہ ناجیہ کے ساتھ پیش پیش تھیں۔

رسم سے پہلے انیقہ کو فوٹو سیشن کے لیے ہال سے ذرا آگے موجود کمرے میں بلوایا گیا تو ناجیہ کو اپنے پاپا کے ساتھ مصروف گفتگو دیکھ کے ثمین اور علینہ اسے تھام کر متعلقہ کمرے تک لے آئیں، جہاں اس کی نندیں اور منگیتر پہلے سے موجود تھے۔

"علینہ! پلیز ذرا امی کو بلا لاؤ۔" وہ اسے کاؤچ پر بٹھا کر پلٹنے کو تھی جب انیقہ نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا تھا۔ اثبات میں سر ہلاتی وہ ثمین کو اس کے پاس ٹھہرنے کے لیے کہہ کر خود کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ مگر سامنے سے آتی ناجیہ اور اس کی امی کو دیکھ کے وہ اپنی جگہ پہ رک گئی تھی۔ تب ہی وسیع و عریض لابی کے دوسری جانب موجود سیڑھیوں سے اپنے دوستوں کے ساتھ اترتے علی شیر کی نظریں اس کے روشنیاں چھلکاتے وجود پہ پڑی تھیں اور وہ اپنا اگلا قدم اٹھانا بھول گیا۔

سر سے پاؤں تک سجی سنوری وہ اپنی پچھلی دو ملاقاتوں کے برعکس بے حد مختلف اور بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ کھلے بالوں کے درمیان اس کا چاند کی طرح دمکتا چہرہ چند لمحوں کے لیے علی شیر کو جیسے مبہوت کر گیا تھا۔

"کیا ہوا یار!" اس کے یوں یک لخت رک جانے پہ اس کے دوستوں نے پلٹ کے اس کی جانب دیکھا تھا جو ان سے کئی سیڑھیاں اوپر کھڑا تھا۔

"ہوں۔۔۔" اپنے دھیان سے چونکتے ہوئے اس نے ایک لحظے کو اپنے دوستوں کی طرف دیکھ کر ایک بار پھر نگاہیں سامنے موجود چمکتے ہوئے وجود پہ جمائی تھیں، جو اب پلٹ کر دو خواتین کے ساتھ آگے کو چل دی تھی۔

"کچھ نہیں۔" دھیرے سے کہتے ہوئے وہ تیز قدموں سے زینہ عبور کر کے ان کے ہم قدم ہو گیا تھا۔ مگر اس کا دھیان چاہ کر بھی علینہ فصیح سے ہٹ نہ سکا تھا۔ جس کا ہر روپ منفرد اور بے حد غضب کا تھا۔

☼ ☼ ☼

تقریباً ساڑھے بارہ بجے کے قریب علینہ، صوفیہ بیگم اور فصیح صاحب کی گھر واپسی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر لاؤنج میں بیٹھ کر تقریب کے بارے میں بات کرنے کے بعد وہ تینوں اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے تھے۔

دروازہ بند کر کے علینہ پیروں کو سینڈلز سے آزاد کرتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ بیٹھی۔ ہاتھ میں پکڑا پرس ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے ایک نظر اپنا جائزہ لینے کے بعد جیولری اتارنی شروع کی تھی۔ جب معاً اس کے پرس میں رکھا موبائل بجنے لگا تھا۔

اپنے دھیان میں پرس کھول کے موبائل نکالتے ہوئے اس نے بنا نمبر دیکھے فون کان سے لگاتے ہوئے جونہی "ہیلو" کہا دوسری جانب سے آتی بھاری گمبھیر آواز اس کی دھڑکن تیز کر گئی تھی۔

"ہیلو علینہ صاحبہ! کیسی ہیں آپ؟" ہیلو کو قدرے کھینچ کر ادا کرتے ہوئے وہ خاصے شگفتہ لہجے میں گویا ہوا تھا۔

"کون بول رہا ہے؟" وہ اسے کسی طور پر تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ اسے پہچان چکی ہے۔ جب ہی اپنی گھبراہٹ پہ قابو پاتے ہوئے اس نے سپاٹ سا لہجہ اختیار کیا تھا۔

"اول تو میں یہ مان ہی نہیں سکتا کہ آپ نے مجھے

نہیں پہچانا۔ لیکن پھر بھی اگر آپ انجان بننے پہ تلی ہوئی ہیں تو کوئی بات نہیں۔۔۔ علی شیر یاران بات کر رہا ہوں۔" وہ محظوظ سے لہجے میں بولا تو اس درجہ گھمنڈ پہ علینہ کی پیشانی شکن آلود کر گیا۔

"آپ کو یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ کوئی آپ کو بھلا نہیں سکتا؟" وہ چاہ کر بھی اپنے لہجے میں در آنے والی تلخی کو چھپا نہ سکی۔ مگر دوسری جانب بھی شاید بلا کا خود پسند شخص تھا۔ جب ہی وہ اس کی بات کا برا مانے بغیر انتہائی سکون سے گویا ہوا تھا۔

"اس لیے کہ علی شیر یاران کو بھلانا اتنا آسان نہیں۔"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ میں کسی علی شیر یاران کو نہیں جانتی تو؟" وہ دوبدو بولی تھی۔

"تو میں یہ کہوں گا کہ جھوٹ آپ جیسی صوم و صلوٰۃ کی پابند لڑکی پہ اچھا نہیں ہے۔" وہ اس کی بات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مزے سے بولا تو دوسری طرف اس کی توقع کے عین مطابق چند پل کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"ڈر گئی ہیں یا یہ سوچ رہی ہیں کہ میں آپ کے بارے میں یہ سب کیسے جانتا ہوں؟" اس نے مسکرا کر سوال کیا تو علینہ اس کے درست اندازوں پہ کھولتی غصے سے بولی۔

"نہ تو میں ڈری ہوں اور نہ ہی حیران ہوں بلکہ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ جیسے ڈھیٹ انسان سے اپنا پیچھا کیسے چھڑاؤں؟"

"آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں۔ ورنہ مجھے یقین ہے کہ آپ یہ نہیں سوچ رہی تھیں۔" وہ ایک بار پھر اس کی بات کا برا مانے بغیر نارمل لہجے میں بولا۔

"دیکھیں علی شیر صاحب! میں غیر مردوں سے باتیں یا ان سے دوستی کرنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ اس لیے پلیز میری آپ سے ریکویسٹ ہے کہ آپ مجھے پریشان مت کریں۔" گہری سانس لیتے ہوئے اس نے قصداً نرمی سے کہا۔

"میں اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں کہ آپ کوئی عام لڑکی نہیں مس علینہ! جب ہی تو میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کی جانب خود پیش رفت کی ہے۔" وہ اس کی استدعا کو نظر انداز کیے بنا کسی ہچکچاہٹ کے اپنا مدعا واضح الفاظ میں بیان کرتا ہوا بولا تو علینہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

"آپ ہوتے کون ہیں میری طرف پیش رفت کرنے والے؟ اور کیا سوچ کر آپ نے مجھے اتنے زعم سے یہ اطلاع دی ہے؟ آپ کوئی اونچی چیز ہوں گے تو اپنے گھر میں۔ میں آپ جیسے کرپٹ لوگوں سے بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہوں۔ دوبارہ مجھے فون کرنے کی غلطی مت کیجیے گا۔" اس کی آواز بے اختیار ہی اونچی ہو گئی تھی۔

"اور دوبارہ آپ بھی مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے کی غلطی مت کیجیے گا!"

وہ یک لخت انتہائی سرد لہجے میں بولا تو علینہ کی شعلے برساتی زبان تالو سے لگ گئی۔ اس کی حیثیت اور اس کی طاقت کا احساس بڑی شدت سے علینہ کے اندر جاگ کر اسے خوف زدہ کر گیا تھا۔

"علی شیر یاران کو آرڈر دینے والا ابھی اس دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ اس لیے آئندہ مجھ سے بات کرتے ہوئے اپنے لب و لہجے کا خیال رکھیے گا۔"

انتہائی کروفر سے بولتا ہوا وہ نئے سرے سے علینہ کے غصے کو ہوا دے گیا تھا۔ وہ شخص خود کو سمجھ کیا رہا تھا؟ جل کر سوچتے ہوئے اس نے بے اختیار دانت پیسے تھے۔

"میں آپ سے دوبارہ بات کروں گی تو کسی چیز کا خیال رکھوں گی ناں!"

"چلیں، دیکھیں گے۔" استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے اس نے جیسے کان پہ سے مکھی اڑائی تھی۔

"ویسے آج آپ آف وائٹ ڈریس میں کافی اچھی لگ رہی تھیں۔ یہ رنگ آپ پہ خاصا جچ رہا تھا۔ اس لیے عموماً یہی پہنا کریں۔"

نرم لہجے میں اس کی سماعتوں پہ بم گراتا وہ فون بند کر گیا تھا اور پیچھے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں اور سنسناتے دماغ

کے ساتھ کتنی ہی دیر اپنی جگہ سے ہلنے کے قابل نہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا؟ لیکن ہم یہ کریں گے کیسے میر؟" اسد نے حیرت سے سامنے بیٹھے آصف کو دیکھا جس کے چہرے پہ بڑی پراسرار سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"سب ہو جائے گا۔ بس ذرا آغا صاحب سے بات ہو جائے' اس کے بعد اس علی شیر یاران اور اس کی پارٹی کو جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکا تو آصف میر نام نہیں۔" وہ غیر مرئی نقطے پہ نگاہ جمائے تنفر سے بولا تو اسد نفی میں سر ہلا گیا۔

"میرا نہیں خیال کہ ہمیں یہ قدم اٹھانا چاہیے' یہ تو سیدھا شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے والی بات ہو گی کیونکہ اور کسی کے علم میں آئے یا نہ آئے علی شیر کو تو پتا ہو گا نا کہ یہ کھیل ہم نے کھیلا ہے۔"

"ہاں تو دشمن کا پتا کاٹنے کے لیے میدان میں تو اترنا پڑے گا نا۔" اسد کی بات آصف کو خاصا بدمزا کر گئی تھی۔

"بے شک اترنا پڑے گا لیکن ہمارا یہ قدم تو ہمیں فرنٹ لائن پہ لا کھڑا کرے گا۔" اسد نے پریشانی سے ایک نظر وہاں موجود باقی لوگوں کی جانب دیکھا۔

"تو تم نے کیا سیاست کو بچوں کا کھیل سمجھ رکھا ہے؟ یہاں کامیابی پانے اور اپنے مخالفین کا سر کچلنے کے لیے فرنٹ لائن پہ ہی سینہ تان کے لڑنا پڑتا ہے۔" آصف نے درشتی سے کہتے ہوئے اسے غصیلی نظروں سے دیکھا تو اسد بے اختیار اک گہری سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے بولا۔

"جانتا ہوں میر! لیکن اگر ہم کوئی وار چھپ کر کریں تو میرے خیال میں وہ ہمارے حق میں زیادہ بہتر ہو گا۔"

"چھوٹے موٹے واروں سے مجھے میرا مقصد نہیں مل سکتا۔ اس وی سی کی باتوں نے میرے یہاں آگ لگا رکھی ہے۔" اس نے انگوٹھے سے اپنے سینے کو ٹھوکا۔ "وہ اس روز کس کی شہ پہ اتنا اچھل رہا تھا میں اچھی طرح جانتا ہوں' لہٰذا پہلے اس فساد کی جڑ کو اکھاڑوں گا پھر اس وی سی سے بھی نپٹوں گا۔۔۔ تم نے میرا ساتھ دینا ہے تو دو ورنہ باہر کا راستہ وہ رہا۔" اس نے حتمی انداز میں کہتے ہوئے آخر میں دروازے کی جانب اشارہ کیا تو اسد لب بھینچے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

ایک بات تو طے تھی کہ اگر اسے پارٹی میں اپنی حیثیت مزید مضبوط کرنی تھی تو وفاداری ثابت کرنے کا اس سے اچھا موقع اسے اور نہیں مل سکتا تھا۔ ویسے بھی علی شیر یاران کے عتاب کا پہلا شکار تو آصف میر کو ہی بننا تھا۔ سوائے کیا پڑی تھی کہ وہ پیچھے ہٹ کر اپنی ایک سال کی محنت پہ پانی پھیرتا۔

"ٹھیک ہے' میں تمہارے ساتھ ہوں!" اندر ہی اندر سود و زیاں کا حساب لگاتے ہوئے وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد مضبوط لہجے میں بولا تو آصف کے لبوں پہ جان دار مسکراہٹ آن ٹھہری۔

"گڈ! مجھے تم سے اسی فیصلے کی امید تھی۔"

☼ ☼ ☼

علینہ کی ساری رات پریشانی کے عالم میں کروٹیں بدلتے ہوئے گزری تھی۔ یہ بات وہ قصداً" اس کے اردگرد موجود تھا یا ہوٹل میں اس کی موجودگی محض ایک اتفاق تھی اسے پریشان کر گئی تھی۔ اس پہ مستزاد اپنی بے بسی کا احساس۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی پریشانی کا ذکر کس سے کرے؟

صوفیہ بیگم اور فصیح الحسن سے اگر وہ بات کرتی تو انہوں نے سب سے پہلے حفاظتی قدم کے طور پہ اس کا یونیورسٹی جانا اور باہر نکلنا بند کرنا تھا۔ پھر فصیح صاحب نے اس علی شیر یاران سے بات کرنی تھی اور وہ جس قسم کا تیز طرار بندہ تھا' علینہ کسی طور نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بابا اس گھٹیا شخص کے منہ لگیں۔

رہا اسد تو اس کے تو متوقع ردعمل کا سوچ کے ہی اسے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ اس کی وجہ سے اسد کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچے وہ ایسا کبھی نہیں چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ساری رات آنکھوں میں

گزارنے کے باوجود اسے اس مسئلے کا کوئی حل سجھائی نہیں دیا تھا۔ مگر۔۔۔ اس پریشانی کو تنہا سہنا بھی اس کے بس میں نہ تھا۔ اسی لیے اپنے دکھتے سر کو نظرانداز کیے وہ یونیورسٹی چلی آئی تھی۔ مگر آگے ان تینوں کو نہ پا کے وہ اتنی پریشان ہوئی تھی کہ کلاس تو کیا یونیورسٹی سے ہی باہر نکل آئی تھی۔

تیز قدموں سے فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے اس کا ارادہ ٹیکسی لے کے گھر جانے کا تھا۔ مگر نجانے کیوں وہ ابھی گھر بھی نہیں جانا چاہ رہی تھی۔ بے چینی کے عالم میں وہ سیدھی سیدھی چلتی یونیورسٹی سے کافی دور چلی آئی تھی۔

اپنی سوچوں میں گم وہ اپنے گردوپیش سے بے خبر آگے بڑھ رہی تھی جب پاس سے گزرتی ایک گاڑی نے تھوڑے فاصلے پہ جا کے بریک لگایا تھا۔ اگلے ہی لمحے گاڑی تیزی سے ریورس ہوتی ایک جھٹکے سے علینہ کے پاس رکی تھی اور وہ جو اپنے دھیان میں چل رہی تھی' بری طرح ڈر کے پیچھے ہٹی تھی۔

غصے سے گھورتے ہوئے اس نے کھا جانے والی نظروں سے گاڑی کی جانب دیکھا تھا۔ مگر اپنے سامنے ایک جانے پہچانے چہرے کو پا کے وہ ایک پل کے لیے ٹھٹکی تھی اور اگلے ہی لمحے جہاں اس کی رنگت فق ہوئی تھی وہیں وہ بے اختیار کتنے ہی قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"آپ کے چہرے کی رنگت بتا رہی ہے کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ہے۔ لیکن چونکہ اتفاق سے ابھی آج تک فیس ٹو فیس تعارف کروانے کا موقع نہیں ملا' اسی لیے' مجھے علی شیر یاران کہتے ہیں۔"

بھاری لہجے میں بولتا وہ پیسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تو علینہ ایک نظر اپنے سامنے کھڑے اونچے لمبے' بے انتہا خوبرو شخص کو دیکھ کر رہ گئی۔ جو سفید کاٹن کے کلف لگے شلوار قمیص میں آنکھوں پہ ڈارک گلاسز لگائے سپاٹ چہرہ لیے اسی کی جانب متوجہ تھا۔

اس کے باہر نکلتے ہی پچھلی سیٹ سے دو باڈی گارڈ گنز اٹھائے اتر کے گاڑی کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ بے اختیار علینہ کی سہمی ہوئی نظریں ان کی جانب اٹھی تھیں اور اسے اپنا حلق خشک پڑتا محسوس ہوا تھا۔

"ہاں تو رات کیا کہہ رہی تھیں آپ کہ آپ مجھ سے دوبارہ بات کریں گی تو کسی چیز کا خیال رکھیں گی۔۔۔ ہوں۔ یہی دیکھنے کے لیے میں آج یونیورسٹی جا رہا تھا کہ اگر میں بات کرنے کے بجائے سیدھا آپ سے ملنے آ جاؤں تو آپ کیا کریں گی؟" اس نے استہزائیہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔

"لیکن آپ نے سرراہ شرف ملاقات بخش کے مجھے نہ صرف زحمت سے بچا لیا بلکہ میرے تجسس کا بھی جلد خاتمہ کر دیا۔ ہاں تو مس علینہ فصیح! اب میں نہ صرف آپ سے بات کر رہا ہوں بلکہ آپ کے سامنے بھی کھڑا ہوں۔ اب کیا کریں گی آپ؟"

چہرے پہ مکمل سنجیدگی لیے وہ اس کے روبرو کھڑا اپنے پرغرور لہجے میں بولا تو علینہ نے حیرت سے اپنی ذات کے نشے میں چور اس شخص کو دیکھا۔ جس کی انا شاید اس کے قد سے بھی زیادہ بلند تھی۔ جب ہی تو اسے اپنی بات کا رد کیے جانا اس قدر ناگوار گزرا تھا کہ وہ ہر کام چھوڑ چھاڑ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

بے اختیار اپنے حلق کو تر کرتے ہوئے اس نے اپنے خوف پہ قابو پانے کی کوشش کی تھی۔ رات اتنی دلیری سے دوبدو جواب دینے کے بعد اب اسے بھی بزدلی دکھانا منظور نہ تھا۔

"لگتا ہے خاصی گہری چوٹ پڑی ہے آپ کی انا پہ یا پھر آپ کو انکار سننے کی عادت نہیں؟" اپنی آواز کا توازن اسے ایک پل کے لیے خود بھی حیران کر گیا تھا۔

"صحیح کہا' مجھے واقعی انکار سننے کی عادت نہیں۔" وہ بازو سینے پہ لپیٹے ہوئے گویا ہوا۔

"دین آئی ایم سوری مسٹر علی شیر! میں آپ کو خوش کرنے کے لیے اپنے اصول سے انحراف نہیں کر سکتی۔" وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے بلا جھجک بولی۔

"اور آپ کا اصول کیا ہے؟" علی شیر کے چہرے پہ اک طنزیہ مسکراہٹ در آئی۔

"اپنی عزت کی حفاظت کرنا۔" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا تو علی شیر کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"آپ نے مجھے ٹھیک پہچانا ہے۔ میں واقعی کوئی عام لڑکی نہیں ہوں اور میں ہی کیا ہر وہ لڑکی خاص ہے جو اپنے ماں باپ کے بھروسے کو ان کی پیٹھ پیچھے بھی قائم رکھتی ہے۔ میں معذرت چاہتی ہوں اگر آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہو' ورنہ میرا مقصد آپ کی انسلٹ کرنا نہیں' بلکہ صرف یہ بات واضح کرنا تھا کہ پلیز مجھے یوں کالز کر کے فالو کر کے پریشان مت کریں۔ میں اپنی ذات سے منسلک لوگوں کو تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

شائستگی سے بولتی وہ اپنی تئیں سامنے کھڑے شخص کے ہر ممکنہ سوال کا جواب دے رہی تھی۔ یہ جانے بنا کہ ڈارک گلاسز کے پیچھے چھپی علی شیر یاران کی آنکھیں اس کے وجود پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اس کا ہر ہر لفظ اس کے خاص نہیں' بلکہ بے حد خاص ہونے کا اعلان کر رہا تھا اور یہ کوئی معمولی احساس نہ تھا۔

"امید ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے' ناؤ پلیز ایکسکیوز می۔ مجھے گھر جلدی پہنچنا ہے۔" اپنی بات مکمل کرتی وہ اس کی سائیڈ سے نکل کر آگے بڑھ گئی تھی اور وہ جو محض اس کی جرأت کی حد دیکھنے کو یونیورسٹی چلا آیا تھا' اب مہر بہ لب کھڑا اسے گہری نگاہوں سے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

علینہ فصیح سے یہ اس کا چوتھا ٹکراؤ اور پہلی باضابطہ ملاقات تھی اور وہ خود سے یہ اقرار کرنے پہ مجبور ہو گیا تھا کہ اگر علی شیر یاران کو بھلانا آسان نہیں تھا تو علینہ فصیح کو بھی ذہن سے جھٹکنا اتنا سہل نہ تھا۔ جبکہ دوسری طرف ٹیکسی میں سوار علینہ نے اپنے بہ خیر و عافیت بچ نکلنے پہ اللہ کا ڈھیروں شکر ادا کیا تھا۔ ورنہ علی شیر یاران کو ان اکھڑے تیوروں کے ساتھ اپنے سامنے جتا دیکھ کے اس کی تو سٹی گم ہو گئی تھی۔ اسے تو اب تک یہ بھی یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے اس درجہ ہمت کا مظاہرہ کر چکی ہے۔

گو کہ اس کی خاموشی اور بے تاثر چہرے سے وہ کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکی تھی' لیکن قوی امکان تھا کہ اس جیسا شاہانہ مزاج والا بندہ اب اس کے پیچھے آنے والا نہ تھا۔ اپنی کامیابی کا احساس اس کے اندر ڈھیروں اطمینان بکھیر گیا تھا۔ رات بھر کی کسلمندی اور بے زاری لمحوں میں ہی کہیں غائب ہو گئی تھی۔

٭ ٭ ٭

سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس' وہ قیمتی کلون کی دلفریب خوشبو میں بسا اپنے دوست کے ولیمے پہ جانے کے لیے تیار ہو کے عجلت میں کمرے سے نکلا تھا۔ مگر لاؤنج میں عالیہ یاران کو کہیں جانے کے لیے تیار دیکھ کے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رک گیا تھا۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ؟" اس نے اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ لیکن پھر بھی ہلکا سا روکھا پن اس کے انداز میں جھلک ہی آیا تھا۔

"واٹ ڈو یو مین۔ کہاں جا رہی ہیں؟ ظاہر ہے کسی پارٹی پہ ہی جا رہی ہوں۔" بھنویں تانے وہ ناگواری سے بولیں تو علی شیر نے بمشکل تمام خود کو کوئی سخت بات کہنے سے روکا تھا۔

"مجھے بھی نظر آ رہا ہے کہ آپ کسی پارٹی میں جا رہی ہیں۔ میں پوچھ رہا ہوں' کس کی پارٹی پہ جا رہی ہیں؟" تمام تر کوشش کے باوجود چند شکنیں اس کی پیشانی پہ نمودار ہو گئی تھیں۔

"تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟" عالیہ یاران سے کوئی سوال جواب کرے یہ بھلا وہ کب برداشت کرتی تھیں۔

"اس لہجے میں جس میں پاپا کو آپ سے بات کرنی چاہیے تھی۔" ان کی جانب دیکھتا وہ انتہائی سرد لہجے میں بولا تو عالیہ کے لبوں کو اک طنزیہ مسکراہٹ نے چھو لیا۔

"تمہارے باپ میں اتنے گٹس نہیں کہ عالیہ تنویر سے سوال جواب کر سکے۔ ویسے بھی وہ اکثر اس وقت

اپنے حواسوں میں نہیں ہوتے۔"

"لیکن مجھ میں نہ صرف گٹس ہیں بلکہ میرے حواس بھی بخوبی قائم ہیں اور میں آپ پہ آج یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کا لیٹ نائٹ اس "سرائے" سے باہر رہنا پسند نہیں!" وہ سرائے پہ زور دیتا ہوا بولا تو عالیہ یاران کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"بہت خوب! تو یہ گھر نہیں' سرائے ہے۔ یعنی تمہارے ماں باپ اتنے خود غرض انسان ہیں کہ انہوں نے اس گھر کو گھر نہیں بلکہ ایک سرائے بنا چھوڑا ہے۔"

"بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔" استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے علی شیر دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ نے جلتی پہ تیل کا کام کیا تھا۔

"تو پھر ایسا ہے صاحبزادے! کہ اس سرائے کو گھر بنانے والی لے آؤ۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ ماں کو باتیں سنانے والا میرا لاڈلا خود کون سی خاص چیز پسند کر کے لاتا ہے۔" غصے سے اسے گھورتی وہ چیلنجنگ انداز میں سینے پہ بازو باندھے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں تو یک لخت علی شیر کی آنکھوں میں کسی کا نازک سراپا اور سماعتوں میں مضبوط لہجہ گونج اٹھا تھا۔

اگلے ہی پل اس کے دماغ نے ایک فیصلہ کیا تھا جس پہ دل نے لمحے کا توقف کیے بنا تصدیق کی مہر لگا دی تھی۔

"لاؤں گا۔ اب میں جلد ہی اس سرائے کو گھر بنانے والی لاؤں گا اور اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ممی تو آپ کو بھی میری بات ماننی پڑے گی۔" ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اس نے مضبوط لہجے میں کہا تو عالیہ یاران نے کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"او کے! لیکن تب تک کے لیے تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔۔۔ امجد! ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔" ملازم کو پکارتی وہ پلٹ کر صوفے پہ پڑا اپنا پرس اٹھا کے لاؤنج سے باہر نکل گئی تھیں اور پیچھے علی شیر اپنا غصہ ضبط کرتا بے اختیار مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا تھا۔

علی شیر نے کراچی کی ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی کے ساتھ ڈیل فائنل کی تھی اور اپنی اسی کامیابی کو سیلیبریٹ کرنے کے لیے وہ کراچی سے آئے اپنے مہمانوں کو ایک شاندار ڈنر کروانے کے بعد ہلکی پھلکی تفریح کے لیے جم خانہ لیے چلا آیا تھا۔ اپنے ملنے ملانے والوں سے حال احوال کرتا وہ اپنے مہمانوں کے ساتھ اوپن ایئر میں چلا آیا تھا۔ جہاں محفل موسیقی کا اہتمام کیا گیا تھا۔

خوشگوار موڈ میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے وہ اس محفل کو خاصا انجوائے کر رہا تھا۔ جب معاً موبائل کی اسکرین پہ رضا یاران کا نمبر جگمگاتا دیکھ کے وہ اپنے مہمانوں سے معذرت کر کے تیز قدموں سے اندر ہال کی جانب بڑھ آیا تھا۔ وہ اس سے یقیناً "اس ڈیل کے بارے میں ہی پوچھنا چاہ رہے تھے۔

کال ریسیو کرتے ہوئے وہ نسبتاً "ایک پرسکون کونے میں دیوار کے ساتھ لگے صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔ مختصر الفاظ میں انہیں ضروری تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے وہ فون بند کرتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ قدم بڑھاتا آصف میر کا نام اسے اپنے دائیں جانب دیکھنے پہ مجبور کر گیا تھا۔ جہاں اس سے کچھ فاصلے پہ مدہم روشنیوں کے سائے میں اسد اعوان اپنی پارٹی کے چند لڑکوں کے ساتھ ڈرنکس سے لطف اندوز ہونے میں مصروف تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے علی شیر واپس اپنی جگہ پہ بیٹھ گیا تھا۔ مگر اس بار احتیاطاً" وہ قدرے بائیں طرف کو ترچھا ہو کے بیٹھا تھا۔

"تم نے اس کا انداز دیکھا ہے' کس طرح سے آرڈر دیتا ہے۔ میرا تو دل کرتا ہے کمینے کا گلا دبا دوں!" ایک آواز علی شیر کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ بے اختیار اس کے لب استہزائیہ انداز میں دھیمے سے مسکرا دیے تھے۔

"بس تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ ایک بار اس علی شیر کا ٹنٹنا ختم ہو جائے۔ پھر اسے میں کیسے اس کرسی سے پٹختا ہوں' تم لوگ دیکھنا۔" کوئی بوجھل آواز میں

بولا تو علی شیر اسے دیکھنے کے لیے دھیرے سے سیدھا ہوا اور اپنے اندازے کے عین مطابق اسد اعوان کو بوتل ہاتھ میں لیے نیا ڈرنک تیار کرتا دیکھ کے وہ خاصا محظوظ ہوتا رخ پھیر گیا تھا۔

"یار! کب آئے گی وہ۔۔۔" اسد نے جھنجلا کر بوتل زور سے میز پہ پٹختی۔

"آہستہ بولو! تم میں تو صبر نام کو نہیں ہے۔" اس کے برابر بیٹھے لڑکے نے بے اختیار اپنے اردگرد دیکھا تھا۔

"پتا نہیں' شادی کے بعد اس کا کیا بنے گا؟ یہ کیسے کسی ایک پہ اکتفا کرے گا؟" ایک نئی آواز نے ہنستے ہوئے چوٹ کی تھی۔

"شادی کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ انسان زندگی کی رنگینیوں سے منہ موڑ لے' بیوی گھر پہ اور ڈبل عیش!" وہ بات کے اختتام پہ زور سے ہنسا تو باقی لڑکے بھی قہقہہ لگا کے ہنس پڑے تھے اور علی شیر اس کی خباثت سے حظ اٹھاتا ایک طنزیہ مسکراہٹ لبوں پہ سجائے اٹھ کر باہر کی جانب بڑھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ پوری طرح سامنے کھلی کتابوں میں گم نوٹس بنانے میں مصروف تھی کہ اچانک پاس پڑے موبائل کی بیل نے اس کا دھیان بٹا دیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر فون اٹھاتے ہوئے اس نے کرسی کی بیک سے کمر ٹکاتے ہوئے جونہی اسکرین پہ نظر ڈالی اس کا "پش" کی جانب بڑھتا انگوٹھا تھم گیا تھا۔ اگلے ہی پل اس نے بھینچے ہوئے لبوں اور دوڑتی دھڑکنوں کے ساتھ کال ڈسکنکٹ کرتے ہوئے موبائل ٹیبل پہ پٹخ دیا تھا اور خود دونوں ہاتھوں میں سر گرا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے صحیح کہا تھا اسے واقعی انکار سننے کی عادت نہیں تھی اور علینہ جو پچھلے چار دنوں سے اس کی خاموشی کو اپنی کامیابی سمجھے ہوئے تھی' علی شیر یار ان کا نمبر اپنے سیل پہ جگمگاتا دیکھ کے مارے جھنجلاہٹ اور بے بسی کے روہانسی ہو گئی تھی۔

اسی اثناء میں سامنے پڑے موبائل پہ میسج ٹون بجی تھی۔ بے اختیار سر اٹھاتے ہوئے اس نے لاچار نظروں سے اپنے سامنے پڑے فون کو دیکھا تھا اور پھر مردنی سے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھاتے ہوئے میسج کھولا تھا۔

"اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں کل یونیورسٹی نہ آؤں تو فون اٹھائیں۔" اور علینہ کی رگیں اس کھلی بلیک میلنگ پہ تن سی گئی تھیں۔ اس گھٹیا شخص نے آخر اسے سمجھ کیا رکھا تھا؟

کھولتے دماغ کے ساتھ اس نے جواب لکھنا شروع کیا تھا' مگر پھر کچھ سوچتے ہوئے تمام الفاظ ڈیلیٹ کر ڈالے تھے۔ تب ہی موبائل ایک بار پھر بجنا شروع ہو گیا تھا۔ اب کی بار علینہ نے دانت پیستے ہوئے کال ریسیو کی تھی اور لمحے کا توقف کیے بنا انتہائی سرد لہجے میں بولی تھی۔

"میں نے سنا تھا کہ برے سے برے انسان میں بھی کہیں نہ کہیں تھوڑی بہت اچھائی اور شرافت ضرور موجود ہوتی ہے۔ مگر آپ نے یہ بات غلط ثابت کر دی ہے مسٹر علی شیر! آپ کا شمار صرف برے نہیں بلکہ برے اور بے حس لوگوں میں ہوتا ہے۔ جن کے نزدیک دوسروں کی ذات' ان کے احساسات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ مگر میں آپ کو بتا دوں میں آپ کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی نہیں بنوں گی۔ میں ابھی اسی وقت اپنے پیرنٹس کو آپ کی گھٹیا حرکتوں کے بارے میں انفارم کرتی ہوں۔ میں انہیں بتاتی ہوں کہ کس طرح۔۔۔"

"چلیں اچھی بات ہے۔ کم از کم اس بہانے ان سے بات تو ہو گی اور مجھے بھی اپنا مدعا بیان کرنے میں تھوڑی سہولت ہو جائے گی۔" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے اطمینان سے بولا تو علینہ کی پیشانی پہ پڑے بل گہرے ہو گئے۔

"ویسے بھی آپ ماں باپ کا مان رکھنے والی بیٹی ہیں اس لیے بہتر یہی ہو گا کہ میں ڈائریکٹ آپ کے والدین سے بات کروں۔ حالانکہ میں نے سوچا تھا کہ ان سے بات کرنے سے قبل ایک بار آپ کی رائے

لے لوں' لیکن آپ تو کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں۔"

"کیسی رائے؟" علینہ کے اندر یک لخت خطرے کی گھنٹی بجی تھی۔

"آپ کوئی بچی نہیں کہ میرے عمل سے آپ کو اب تک کچھ سمجھ میں نہ آیا ہو۔ آپ مجھے روز اول سے ہی باقی لڑکیوں سے منفرد اور خاص لگی تھیں اور آنے والے وقت نے میرے اس اندازے کی تصدیق کی تھی۔ میں آپ کی جانب خود کو متوجہ ہونے سے روک نہیں سکا تھا۔ پہلے پہل میری نیت صرف آپ کو قریب سے جاننے اور دوستی کرنے کی تھی۔ لیکن ہماری آخری ملاقات نے مجھ پہ واضح کر دیا کہ آپ خاص نہیں' بلکہ بہت خاص لڑکی ہیں۔ آپ کے خیالات کی پاکیزگی اور کردار کی مضبوطی نے مجھے آپ کی عزت کرنے پہ مجبور کر دیا ہے اور یقین مانیں! کسی عورت کے بارے میں ایسے احساسات میں نے پہلی بار محسوس کیے ہیں۔ میں نے پہلی بار۔۔۔"

"ایکسکیوزمی مسٹر علی شیر! یہ پہلی بار کی داستان آپ اب تک کتنی لڑکیوں کو سنا چکے ہیں؟" علینہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں پوچھا تو علی شیر اک گہری سانس کھینچتے ہوئے بولا۔

"پہلی بار" کی داستان سننے والی آپ اب تک واحد ہیں۔ جہاں تک لڑکیوں سے فلرٹ کرنے کی بات ہے تو ٹو بی ویری آنسٹ تعداد یاد نہیں' لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ وہ محض لفاظی تھی جبکہ جو میں آج سنا رہا ہوں اس کا حرف حرف سچا ہے۔ مجھ جیسا مرد اتنی آسانی سے اپنا آپ ہر کسی پہ نہیں کھولتا اور اگر آج میں آپ سے یہ سب کہہ رہا ہوں تو اس کا کریڈٹ صرف آپ کو جاتا ہے۔ میں ان مردوں میں سے ہوں جو اپنی ازدواجی زندگی میں پہلی ترجیح ایک ایسے مضبوط گھر کو دیتے ہیں جس کی بنیادیں اعتبار' محبت اور عزت پہ قائم ہوں۔

ہو سکتا ہے آپ کو میری بات پہ یقین نہ آ رہا ہو لیکن یہ سچ ہے کہ ان گنت لڑکیوں سے دوستی کے باوجود میں نے اب تک شادی صرف اس لیے نہیں کی کہ مجھے رشتوں کو نبھانے اور گھر بنانے والی لڑکی کی تلاش تھی اور میری یہ تلاش آپ کو جان کر اب ختم ہو گئی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ مجھے آپ سے کوئی دھواں دھار قسم کا عشق ہے۔ لیکن چونکہ آپ میرے آئیڈیل کے بے حد قریب ہیں اس لیے آپ نہ صرف مجھے بہت اچھی لگنے لگی ہیں بلکہ میں آپ سے شادی کا خواہش مند ہوں اور اسی سلسلے میں آپ کی رائے درکار تھی تاکہ میں مزید کسی تاخیر کے اپنے پیرنٹس کو آپ کے گھر بھیج سکوں۔" انتہائی نارمل لہجے میں اس نے اپنی ترجیحات سے لے کے پسندیدگی اور پرپوزل تک سب کچھ ایک ساتھ کہہ سنایا تھا اور ساکت بیٹھی علینہ کے لیے کچھ بھی کہنا محال ہو گیا تھا۔

"آپ جیسے بندے کی اپنی لائف پارٹنر کے بارے میں اتنی مختلف سوچ ہو سکتی ہے مجھے جان کے حقیقتاً خاصی حیرت ہوئی ہے۔ لیکن جہاں تک میری رائے کا سوال ہے تو یقین جانیں علی شیر صاحب! میری رائے آپ کے کسی کام کی نہیں ہے کیونکہ میرا اور آپ کا کبھی بھی کوئی رشتہ نہیں بن سکتا۔" علی شیر کے لہجے کی سنجیدگی اسے یہ باور کروا گئی تھی کہ اگر وہ اس مشکل سے نکلنا چاہتی ہے تو اسے اس لمحے جوش سے نہیں بلکہ ہوش سے کام لینا پڑے گا۔ پتا نہیں ۔۔۔ کیوں اسے علی شیر کے لہجے میں سچائی بولتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اسے نہ صرف سمجھ چکا ہے بلکہ تنگ کرنے اور اس سے فلرٹ کرنے کا ارادہ بھی موقوف کر چکا ہے۔ لیکن اس کا جواب سن کے اس کا کیا ردعمل ہونے والا تھا' وہ سوچ کے خاصی پریشان ہو رہی تھی۔ اسی لیے اس نے بہت طریقے سے تمہید باندھی تھی۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" مقابل کے لہجے میں ہلکی سی بے چینی در آئی تھی۔

"کیونکہ میری منگنی ہو چکی ہے۔" دھیمی آواز میں کیا گیا انکشاف ایک پل کے لیے علی شیر کو خاموش کر گیا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟ کہیں وہ اس سے ڈر کے جھوٹ کا سہارا تو نہیں لے رہی تھی؟ لیکن اس کے

اگلے جملے از خود علی شیر کا ہر اندیشہ مٹا گئے تھے۔

"اور آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میں آپ کو ٹالنے کے لیے جھوٹ بول رہی ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے لیے حقیقت پتا کروانا کوئی مشکل کام نہیں۔" مدہم لہجے میں بولتی وہ علی شیر کو لب بھینچنے پہ مجبور کر گئی تھی۔

نجانے کیوں لیکن اس کی منگنی کی اطلاع پہ علی کو اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا تھا۔ افسردگی کا احساس بڑی شدت سے اس کے اندر جاگا تھا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں کون خوش نصیب ہے وہ؟" خود پہ قابو پاتے ہوئے اس نے آہستگی سے استفسار کیا تو علینہ خاموش ہو گئی۔ وہ اسد کا نام بتا کر اسے کسی مشکل میں گرفتار نہیں کروانا چاہتی تھی۔ جبکہ ایک لمحہ پہلے وہ خود کہہ رہی تھی کہ اس کے لیے حقیقت پتا کروانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لیکن یہ اس کی اسد سے محبت تھی جو وہ اپنا ہی کہا بھلائے یک لخت چپ ہو گئی تھی۔

"آپ اگر مجھ پہ بھروسا کریں گی تو مجھے اچھا لگے گا۔" اس کی خاموشی منٹ میں علی شیر پہ اس کی سوچ واضح کر گئی تھی۔

بے اختیار علینہ نے اک گہری سانس ہوا کے سپرد کی۔

"اسد اعوان۔" اور دوسری جانب موجود علی شیر بری طرح چونک گیا تھا۔

"وہ اسد اعوان جو آصف میر کی پارٹی میں ہے؟" علی شیر نے بے یقینی سے کہا۔

"جی!" وہ جانتی تھی اس سے کچھ بھی چھپانا فضول تھا۔ علینہ کے جواب پہ علی شیر کی بے یقینی آن واحد میں تاسف میں تبدیل ہو گئی تھی۔

"سوری ٹو سے مس علینہ! لیکن وہ شخص کسی بھی طرح آپ کے لائق نہیں!" اس کا تبصرہ علینہ کی پیشانی کو نئے سرے سے شکن آلود کر گیا تھا۔ کتنا گھٹیا انسان تھا یہ!

"مجھے تو لگا تھا کہ آپ حقیقت کو بڑے ظرف سے قبول کریں گے لیکن آپ تو مسٹر علی شیر! اوچھے ہتھکنڈوں پہ اتر آئے ہیں۔" اس کی بے اعتباری نے علی کو سلگا کے رکھ دیا تھا۔

"میں نے صرف سچائی بیان کی ہے جو مجھے یقین ہے نہ آپ کے علم میں ہوگی اور نہ ہی آپ کے ماں باپ کے۔ ورنہ اتنا گھٹیا انسان۔۔۔"

"بس کریں! میں اسد کے بارے میں ایک لفظ اور نہیں سنوں گی!" اس کا لہجہ ہی نہیں بلکہ آنکھیں بھی شعلے برسانے لگی تھیں۔

"بہت پسند ہے وہ آپ کو؟" علی شیر کو اپنے اندر جلن سی اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔

"ہاں!" وہ زور دے کے بولی تو علی شیر کا دل جل کے خاک ہو گیا۔

"پھر تو آپ کی اعلا چوائس کی داد دینی پڑے گی۔ کیا ہیرا چنا ہے۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا تو علینہ کا ضبط جواب دے گیا۔

"وہ ہیرا ہے یا پتھر، آپ کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے اور آپ خود کون سے پارسا ہیں جو دوسروں کے کردار پہ انگلی اٹھا رہے ہیں۔"

"مجھے پارسائی کا کوئی دعوا نہیں۔ لیکن آپ کے مسٹر رائٹ کی طرح میں اپنی شریک حیات کو کم از کم دھوکا دینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ بقول آپ کے ہر برے انسان میں کہیں نہ کہیں تھوڑی بہت اچھائی اور شرافت ضرور موجود ہوتی ہے۔ سو میں نے بھی اپنے اندر کی اچھائی اور شرافت اپنی بیوی کے لیے سنبھال رکھی ہے۔ اور اگر آپ یہ سوچ رہی ہیں کہ میں آپ کو آپ کے منگیتر سے بدگمان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو معاف کیجیے گا محترمہ! لیکن علی شیر یاران دوسروں کی چیزوں کی طرف نظر اٹھا کے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ آپ کو آپ کی پسند مبارک ہو۔ اسد اعوان کتنے پانی میں ہے، یہ آپ کو وقت بتائے گا۔ لیکن میری خواہش ہے کہ آپ پر اس کی اصلیت، کسی ناقابل تلافی نقصان سے پہلے واضح ہو جائے۔"

وہ سرد لہجے میں اپنی بات مکمل کرتا کھٹ سے فون

بند کر گیا تو غصے سے کھولتے ہوئے علینہ نے بھی موبائل ٹیبل پہ پٹخ دیا۔

"ہونہہ!" تنفر سے سوچتے ہوئے اس نے سامنے کھلی کتاب ہاتھ مار کے بند کر دی تھی۔

☆ ☆ ☆

آنے والا دن یونیورسٹی کے در و دیوار ہلا گیا تھا۔ علی شیر یاران کی پارٹی کے اہم رکن مغیث احمد کے پاس سے وی سی صاحب نے سب کے سامنے ہیروئین برآمد کی تھی اور مغیث پھٹی پھٹی بے یقین آنکھوں سے اپنی جیکٹ کی بیرونی جیب سے نکلتی پڑیا کو دیکھ کے بے اختیار چلا اٹھا تھا۔

"سر! یہ میری نہیں ہے۔" فق ہوتی رنگت کے ساتھ اس نے متوحش نگاہوں سے داور کی جانب دیکھا تھا جو خود بھی سناٹے کی کیفیت میں کھڑا وی سی کے ہاتھ میں پکڑے سفید پاؤڈر کے اس چھوٹے سے پیکٹ کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں موجود ہر شخص کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا سوائے آصف میر، اسد اور ان کی پارٹی کے دیگر بندوں کے جن کے چہرے بے تاثر، لیکن آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"بکواس بند کرو! میں نے سب کے سامنے اسے تمہاری جیب سے نکالا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ تمہاری نہیں؟" وی سی نے ہاتھ میں پکڑا پیکٹ اس کے سامنے کرتے ہوئے قہر آلود نظروں سے اسے گھورا۔

"میں قسم کھاتا ہوں سر! یہ میری نہیں اور یہ 'یہ میری جیب میں کیسے آئی' میں یہ بھی نہیں جانتا۔" انہیں اپنی بات کا یقین دلاتے ہوئے وہ روہانسا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑا داور بھی ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ ساری صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر یہ پیکٹ مغیث کی جیب میں آیا کہاں سے تھا؟ لب کچلتے ہوئے یک لخت اس کی نظریں ان کے پیچھے کھڑے آصف اور اسد کے چہروں سے ٹکرائی تھیں اور وہ بے اختیار ٹھٹک گیا تھا۔

وی سی کو ان کے آفس سے لانے والا بھی تو اسد اعوان ہی تھا۔ اسے بھلا کیسے پتا چلا تھا کہ مغیث کی جیکٹ میں ہیروئین تھی۔

"سر! مغیث صحیح کہہ رہا ہے۔ یہ سارا کھیل ان کا رچایا ہوا ہے۔ انہی نے پھنسایا ہے اسے۔" لال انگارہ آنکھیں لیے داور نے لپک کر اسد کا گریبان پکڑنا چاہا تھا، مگر وی سی اور چیئرمین نے تیزی سے آگے آتے ہوئے اسے پیچھے دھکیلا تھا۔

"اپنی حد میں رہو داور! ان کا بھلا اس معاملے سے کیا تعلق؟" وی سی نے اسے گھورتے ہوئے غصے سے کہا۔

"کہنے دیں سر! ان کا تو ہمیشہ سے یہی کام رہا ہے۔ اپنا گند ہم پہ اچھالنے کی پرانی بیماری ہے انہیں لیکن داور سہیل! اس بار سچائی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ہیروئین تمہارے دوست کی جیب میں سے سب کے سامنے برآمد ہوئی ہے!"

طنزیہ انداز میں بولتا آصف میر، داور کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"اگر ہیروئین میرے دوست کی جیب میں تھی تو تمہیں کیسے پتا چلا؟" داور نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے پوچھا۔ تو آصف کے چہرے پہ اک استہزائیہ مسکراہٹ در آئی۔

"جب یہ علی شیر یاران کے بندے سے یونیورسٹی کے باہر کھڑا یہ زہر لے رہا تھا تب اسے اسد نے دیکھ لیا تھا۔ اس نے فوراً آ کے مجھے بتایا تھا اور تب ہی میں نے وی سی صاحب کو مطلع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ علی شیر یاران کی حقیقت کیا ہے، یہ ہم تو جانتے ہی تھے لیکن آج جس طرح تم لوگ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہو۔ اس نے سب پہ تمہاری اور اس کی حقیقت عیاں کر دی ہے جو سیاست کی آڑ میں منشیات فروشی جیسا گھناؤنا جرم اس یونیورسٹی میں کر رہا ہے۔"

آصف میر بلا خوف و خطر داور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گویا ہوا تو اتنے بڑے الزام پہ داور کا دماغ گھوم گیا۔

اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ رکھ کے ایک مکا آصف کے منہ پہ رسید کیا جو اگلے ہی پل مارے اذیت کے دوہرا ہو گیا تھا۔

"بہت ہو گیا تماشا' بلواؤ باران صاحب کو!" وی سی نے انہیں چھڑاتے ہوئے دہاڑ کر اپنے پی اے کو حکم دیا جو اثبات میں سر ہلاتا ان کے آفس کی جانب لپکا تھا۔ اس دوران اسٹوڈنٹس ان دونوں کو الگ کر چکے تھے۔

"یہ میری تم لوگوں کو آخری وارننگ ہے' اب اگر کسی نے بھی ایک دوسرے کو ہاتھ لگایا تو میں پولیس کو کال کرنے میں منٹ نہیں لگاؤں گا!" انگلی اٹھائے وہ عالم طیش میں چلائے تھے۔ "سیدھے طریقے سے تم چاروں میرے آفس میں چلو۔"

انہوں نے آصف' اسد' مغیث اور داور کو اشارہ کیا "باقی سب اپنی کلاسز میں جائیں اور پلیز جب تک ہم معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتے میری آپ سب سے ریکویسٹ ہے کہ اس معاملے کو باہر ڈسکس کرنے سے گریز کریں کیونکہ یہ ہماری یونیورسٹی کی ساکھ اور آپ سب کے مستقبل کا سوال ہے۔"

ارد گرد کھڑے طلبہ سے درخواست کرتے وہ پلٹ کر اپنے آفس کی طرف بڑھ گئے تھے۔ ان کے پیچھے چیئرمین اور چند ایک آفیشلز ان چاروں کو لیے آگے بڑھے تھے۔ جبکہ لیکچرارز اور پروفیسرز نے وہاں موجود ہجوم کو ان کی کلاسز کی جانب روانہ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا بکواس ہے یہ؟" وی سی صاحب کے منہ سے ساری تفصیل سن کے علی شیر کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ نکلے تھے۔ مارے غضب کے ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس نے مقابل پڑے صوفے پر بیٹھے آصف میر کو گریبان سے پکڑ کے اپنے سامنے کھڑا کیا تھا۔

"تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھ پہ اتنا گھٹیا الزام لگانے کی؟" اور اس کا انگارے کی طرح دہکتا وجود اپنے روبرو پا کے جہاں اس تمام عرصے میں پہلی بار آصف میر کو اپنا حلق خشک پڑتا محسوس ہوا تھا وہیں اسد اعوان کو بھی اپنے گلے کے گرد پھندا کستا ہوا محسوس ہوا تھا۔ آخر سب کے سامنے چشم دید گواہ کی حیثیت سے تو وہی آیا تھا۔

"باران صاحب! تحمل سے کام لیں۔ یہ صرف آپ کی نہیں بلکہ ہماری بھی عزت کا سوال ہے۔" وی سی نے پریشانی سے کہا تو علی شیر کتنی ہی دیر لب بھینچے آصف کو شعلے برساتی نظروں سے گھورتا رہا اور پھر ایک جھٹکے سے اسے پیچھے کو دھکیلتا وی سی کی جانب پلٹا۔

"علی شیر باران کی عزت اتنی ہلکی نہیں اصغر صاحب کہ کوئی بھی راہ چلتا دو ٹکے کا بے ضمیر انسان اس پہ سوالیہ نشان کھڑا کر سکے۔ میں چاہوں تو ڈی آئی جی سے لے کے آئی جی تک یہاں بلوا کر منٹ میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کروا دوں۔ لیکن میں ایسا کروں گا نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ایک سرد نظر آصف اور اسد پہ ڈالی۔ جو اس کے چہرے سے چھلکتے پراسرار اور خوفناک عزائم دیکھ کے اندر ہی اندر ڈر گئے تھے۔

"اس آصف میر نے اپنے اس چیلے کو استعمال کر کے گندی سیاسی چال کے ذریعے مجھے یہاں سے بے دخل کرنے کی کوشش کی ہے نا۔ اب آپ دیکھیے گا کہ کل یہی اسد اعوان اسی جگہ پہ کھڑے ہو کے کیسے اپنے میر صاحب کے رچائے اس ڈرامے پہ سے پردہ اٹھائے گا۔"

اس نے شہادت کی انگلی سے اسد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چٹانوں کی طرح مضبوط لہجے میں کہا تو اسد کا دل ایک لمحے کو ڈوب سا گیا۔ علی شیر کے تیور چیخ چیخ کر اس بات کا اعلان کر رہے تھے کہ اگر اسے اپنے نام پہ لگا داغ مٹانے کے لیے اسد اعوان کی کھال بھی کھنچوانا پڑی تو وہ احتراز نہیں کرے گا۔

"تم ہمیں دھمکا رہے ہو؟" آصف نے اپنے گرتے حوصلے کو سنبھالا دیتے ہوئے بہادری دکھانا چاہی تھی لیکن علی شیر کا جواب اور انداز اسے سن کر گیا تھا۔

"ہاں اور تم اپنے بچاؤ کے لیے جو کرنا چاہتے ہو کر لو اور اصغر صاحب کل جب سچائی سب کے سامنے آئے گی تو یہ شخص اور اس کے بندے سب اسٹوڈنٹس کے سامنے نہ صرف مغیث سے معافی مانگیں گے بلکہ اس یونیورسٹی میں بھی نہیں رہیں گے۔" اس نے آصف سے بات کرتے ہوئے اچانک رخ موڑ کر وی سی کی جانب دیکھا تھا۔

اپنی بات مکمل کرتا' اسد کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ جس کا تو جیسے خون ہی وہیں کھڑے کھڑے علی شیر کے نڈر اور بے فکر انداز نے خشک کر ڈالا تھا۔

"اور تمہاری طرف تو ویسے بھی اسد اعوان میرا ایک پہلا حساب بھی نکلتا ہے۔" وہ اس کے سامنے کھڑا دھیمے لیکن ٹھنڈے لہجے میں بولا تو اسد کا تیزی سے دھڑکتا دل جیسے تھم سا گیا۔ "یہ کس حساب کی بات کر رہا ہے؟" اس نے الجھ کر سوچتے ہوئے سامنے کھڑے شخص کا چہرہ دیکھا' جس پہ بے اختیار اک طنزیہ مسکراہٹ اپنی چھب دکھلا کر غائب ہو گئی تھی۔

"پریشان مت ہو' جلد پتا چل جائے گا جب ہم دوبارہ ملیں گے۔" وہ دوبارہ پہ زور دیتا وی سی کی جانب پلٹا تو اسد نے بے اختیار گھبرا کر آصف میر کی طرف دیکھا جو خود بھی پریشان نظروں سے علی شیر کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"او کے اصغر صاحب! چلتا ہوں۔ امید ہے آپ کل تک کی مہلت دیں گے مجھے۔" اس نے مسکرا کر لطیف سا طنز کیا تو سبھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"پریشان مت ہونا!" مغیث کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے اس نے ایک کاٹ دار نظر آصف پر ڈالی اور باہر کی طرف چل دیا۔ جبکہ آصف کے شاطر دماغ نے تیزی سے نئے تانے بانے بننے شروع کر دیے تھے۔

وی سی صاحب کے بند آفس میں کیا بات ہوئی تھی اور کیا نہیں' کسی کو ٹھیک سے کچھ پتا نہیں تھا۔ لیکن ہر ایک کے منہ سے کچھ نہ کچھ سننے کو ضرور مل رہا تھا اور ان ساری افواہوں نے مل کر علینہ کی حالت غیر کر ڈالی تھی اس پہ مستزاد گزشتہ رات علی شیر کے ساتھ ہونے والی گفتگو۔ وہ حد درجہ ہراساں اور پریشان تھی۔ مگر تسلی کے لیے اسد کا دور دور تک پتا نہ تھا۔

وہ وی سی کے آفس سے نکل کر آصف میر کے ساتھ کہاں گیا تھا' کسی کو علم نہ تھا۔ اس کا موبائل بھی مسلسل بند تھا' ایسے میں وقفے وقفے سے اس کا نمبر ٹرائی کرتی علینہ بالآخر تھک کر رو پڑی تھی۔ گھر میں آج کے واقعے کا ذکر اس نے قصداً نہیں کیا تھا مبادا اسد اس بات کے ڈسکس کیے جانے پہ برا مان جاتا۔

وہ بہانے سے دو بار اکبر انکل کی طرف بھی فون کر چکی تھی۔ اتفاق سے دونوں مرتبہ فون رخشندہ آنٹی نے ریسیو کیا تھا اور ہمیشہ کی طرح خاصی رکھائی سے اسے اسد کی غیر حاضری کے متعلق بتایا تھا۔ ان کا انداز ان کی لاعلمی کو ظاہر کر رہا تھا اور اس بات نے اس کی پریشانی کو سوا کر دیا تھا۔ آخر اسد گیا کہاں تھا؟

سرشار سے اسد نے' آغا فیروز کے عنایت کردہ گارڈز کے ہمراہ جس وقت گھر کے اندر قدم رکھا گھڑی رات کے سوا بارہ بجا رہی تھی۔ وہ اور آصف وی سی کے آفس سے نکل کر سیدھا آغا فیروز کے گھر گئے تھے۔ جو ان کی پارٹی کے نائب صدر تھے اور جن کی اجازت پہ ہی میر نے یہ قدم اٹھایا تھا۔

ساری بات سن کے انہوں نے ان دونوں کو پورا دن اپنے گھر میں ہی رکنے کی ہدایت کی تھی اور اب آدھی رات کو گارڈز کے ہمراہ وہ دونوں اپنے اپنے گھروں کو لوٹے تھے۔

ہر طرف سے مطمئن ہو کے اسد اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ بے اختیار اس کی نظریں گھڑی کی جانب اٹھی تھیں اور اس کے چہرے پہ بڑی بھرپور فاتحانہ مسکراہٹ چمکی تھی۔

"ہونہہ! بڑا آیا مجھ سے سچ اگلوانے والا۔" نفرت سے ہنکارا بھرتا وہ اپنے بیڈ پہ گر سا گیا تھا۔

"تم اور تمہاری دھمکیاں... ہونہہ مسٹر علی شیر باران... دیکھتے ہیں اب تم کل اسی آفس میں ان ہی لوگوں کے درمیان اپنے کہے کی دھجیاں کیسے سمیٹو گے:" سرشاری سے سوچتے ہوئے اس نے مطمئن انداز

میں آنکھیں موندلی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے علینہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹا؟" ناشتے کی میز پہ اسے بے دلی سے صرف چائے پیتا دیکھ کے صوفیہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا تھا جہاں تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ پژمردگی بھی بکھری ہوئی تھی۔

ان کی بات پہ فصیح صاحب نے بھی ہاتھ میں پکڑے اخبار پر سے نظریں اٹھاتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تھا جو آج خلاف عادت بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

"جی طبیعت تو ٹھیک ہے لیکن سر میں درد ہو رہا ہے۔" وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولی۔

"تو آج چھٹی کرلو بیٹا۔" فصیح صاحب نے اخبار تہہ کرکے ایک طرف رکھتے ہوئے چائے کا کپ اپنے سامنے کیا۔

"نہیں بابا! آج جانا بہت ضروری ہے۔" وہ چائے کا آخری گھونٹ لیتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جانا ضروری ہے تو کم از کم ناشتا تو ٹھیک سے کر کے جاؤ۔" صوفیہ بیگم نے اسے خفگی سے دیکھتے ہوئے ٹوکا۔

"دل نہیں کر رہا.... اوکے بابا اور امی اللہ حافظ!" وہ بیگ اٹھائے پورچ میں چلی آئی جہاں ڈرائیور اس کا منتظر تھا۔

اس کے بیٹھتے ہی گاڑی منزل کی جانب روانہ ہوگئی تھی۔ علینہ نے بیگ میں سے موبائل نکالتے ہوئے ایک بار پھر اسد کا نمبر ملایا تھا۔ رات سے مسلسل "پاورڈ آف" کی گردان سنتے سنتے اس کے کان پک گئے تھے، لیکن اس بار بیل جاتی سن کے اس نے بے اختیار شکر کا سانس لیا تھا۔

مگر وقفے وقفے سے جاتی بیل کے باوجود دوسری جانب سے جب کسی نے فون ریسیو نہیں کیا تو جھنجلا کر کال کاٹتے ہوئے اس نے ایک بار پھر نمبر ملایا تھا۔ لیکن بے سود۔

لب بھینچے اس نے کال ڈسکنیکٹ کرتے ہوئے پریشان نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھا تھا۔

"پتا نہیں اسد فون کیوں نہیں اٹھا رہا تھا؟ اے میرے پروردگار! تو اسد کی حفاظت کرنا، اسے دشمنوں کے ہر وار سے محفوظ رکھنا مولا!" اپنے دل میں امڈتے ڈھیروں وسوسوں سے گھبرا کر اس نے نم آنکھوں کے ساتھ بے اختیار اپنے رب کو پکارا تھا۔ مگر مضطرب دل کی گھبراہٹ کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی جارہی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ جب تک وہ اسد کو دیکھ نہیں لے گی، اس سے بات نہیں کرے گی اس کی یہ بے چینی دور ہونے والی نہیں تھی اور اسی لیے وہ جلد از جلد یونیورسٹی پہنچنا چاہتی تھی۔ خدا خدا کرکے سفر تمام ہوا تو وہ تیز قدموں سے پارکنگ لاٹ کراس کرتی گیٹ کی جانب بڑھی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اندر داخل ہوتی ایک مردانہ پکار نے اس کے تیزی سے اٹھتے قدم روک دیے تھے۔

"ایکسکیوزمی مس!"

"جی۔" چونک کر پلٹتے ہوئے اس نے خود سے ذرا فاصلے پہ کھڑے لڑکے کی طرف حیرت سے دیکھا تھا جو اس کے لیے بالکل انجان تھا۔

"آپ کا نام علینہ فصیح ہے؟" اس نے قریب آتے ہوئے شائستگی سے پوچھا تو علینہ گھبرا سی گئی۔

"دیکھیں گھبرائیں مت، میں اسد کا دوست ہوں۔" اس کا اضطراب یقیناً مقابل نے بھی بھانپ لیا تھا جب ہی اگلے ہی پل وہ اسد کا حوالہ دیتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں بولا تو علینہ اس کے منہ سے اسد کا نام سن کے بے قراری سے بولی۔

"جی میں ہی علینہ فصیح ہوں۔ آپ بتائیں سب خیر تو ہے نا؟ اسد ٹھیک تو ہے؟"

"جی سب خیر ہے۔ اسد بالکل ٹھیک ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔ بس مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ہم بیچ راستے سے ہٹ

کے ایک طرف ہوجائیں؟"

نرمی سے کہتے ہوئے اس نے علینہ کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے اقرار پہ وہ لڑکا لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس پارکنگ لاٹ کی طرف چل دیا تو علینہ بھی تیز قدموں سے اس کے پیچھے ہولی۔

ایک نسبتاً خاموش سائیڈ پہ وہ ایک سیاہ کرولا کے پاس آکر رکا ہوا تو علینہ بھی چلتی ہوئی اس سے ذرا فاصلے پر آرکی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی۔ گاڑی کے پچھلے دروازے میں سے دو تگڑی عورتیں نکل کے اس کے دائیں بائیں آکھڑی ہوئیں۔ ساتھ ہی سامنے کھڑے لڑکے نے اپنی جیب میں سے چھوٹی سی پسٹل نکال لی۔

"آواز نکالنے یا شور مچانے کی غلطی مت کیجیے گا مس علینہ! کیونکہ آپ کے اسد اعوان صاحب ہمارے قبضے میں ہیں۔ آپ کی چھوٹی سی غلطی ان کی وہاں جان لے سکتی ہے۔ اس لیے خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ جائیں۔"

دھیمے لیکن انتہائی سرد لہجے میں کہتے ہوئے اس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تو علینہ کی مارے دہشت کے آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

"ک... کون ہو تم لوگ اور تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" مگر اس کی بات کا جواب ان تینوں میں سے کسی نے بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

لڑکے کے اشارے پہ ایک عورت نے اس کا بیگ اپنے قبضے میں لیا تھا۔ جبکہ دوسری نے مضبوطی سے اس کا بازو پکڑ کے اسے اپنے ساتھ کار میں گھسیٹ لیا تھا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور تیزی سے ہوا تھا کہ علینہ اپنے منتشر حواس کو سمیٹ بھی نہ سکی تھی اور گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

تقریباً پچیس، تیس منٹ کی مسافت کے بعد گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ علینہ کی آنکھوں پہ چونکہ پٹی باندھ دی گئی تھی اس لیے اسے کچھ اندازہ نہ تھا کہ اسے کہاں لایا گیا تھا۔ لیکن کس کے کہنے پہ لایا گیا تھا۔ اس حقیقت سے وہ کچھ کہے سنے بنا بھی بخوبی واقف تھی۔ علی شیر باران کے متعلق اس کے بدترین خدشات آخر کار سچ ثابت ہوئے تھے۔ وہ خود کو چاہے کتنی ہی سلجھی ہوئی سوچ کا مالک کیوں نہ ظاہر کرتا اس کی حقیقت یہی غنڈہ گردی اور بدمعاشی تھی۔ اس نے اپنا اصل دکھانے میں چار دن بھی نہ لیے تھے اور اب وہ علینہ اور اسد کی صورت میں اپنے ایک نہیں بلکہ دو دو دشمنوں سے دشمنی نکال رہا تھا۔ پتا نہیں اسد کے ساتھ اس ذلیل آدمی نے کیا سلوک کیا تھا؟ اس بے چارے کو تو اس حقیقت کا علم بھی نہیں تھا کہ یہ گھٹیا شخص اس کے پیچھے پڑا تھا۔

بہتے اشکوں کے ساتھ علینہ کو مسلسل اسد کی فکر ستائے جارہی تھی۔ اسی حد تک کہ وہ خود اپنی ذات کو بھی فراموش کر گئی تھی۔ مگر جب گاڑی رکتے اسے بند آنکھوں کے ساتھ بازو سے پکڑ کر نیچے اتار لیا گیا اور پھر اسی طرح پکڑ کے اندر کسی کمرے میں لے جایا گیا۔ تو اس تمام عرصے میں پہلی بار اسے اپنی بے بسی کا احساس ہوا تھا۔ وہ اغوا کر کے علی شیر باران کے قدموں میں ڈال دی گئی تھی۔ جو اب جیسا چاہے اس کے ساتھ سلوک کرسکتا تھا۔

آگہی کا یہ احساس اس قدر جان لیوا تھا کہ اس کے ہر مسام میں سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ اسے اپنا دل بیٹھتا اور سر بری طرح چکراتا محسوس ہوا تھا۔

اس کی آنکھوں پہ بندھی پٹی کسی نے اتار دی تھی۔ روتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں کو مسلتے ہوئے بے قراری سے چاروں طرف دیکھنا چاہا تھا اور تب ہی اس کے کانوں سے ایک جانی پہچانی نسوانی آواز ٹکرائی تھی۔

"علینہ!" اگلے ہی لمحے کوئی اس سے دوڑ کے آلپٹا تھا۔

"ف... فریحہ تم؟" آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہ خود سے لپٹی زاروقطار روتی فریحہ کو دیکھ کے

ساکت رہ گئی تھی۔

"تم، تم یہاں کیسے؟ اور اسد کہاں ہیں؟" اس نے فریحہ کو خود سے الگ کرتے ہوئے متوحش نظروں سے اپنے پاس کھڑی عورت کا چہرہ دیکھا تھا۔

"تم مجھے یہ لوگ کالج جاتے ہوئے راستے سے پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں اور بھائی تو گھر پہ ہی تھے۔" وہ آنسوؤں کے درمیان بولی تو علینہ کا شل ہوتا ذہن ٹھٹک سا گیا۔

"اس، اس کا مطلب ہے کہ ہم دونوں یہاں۔۔۔"

"تنہا ہیں۔ اسد اعوان تو اب آئے گا میرے بندوں کا فون سن کے!" یکایک ان کے پیچھے ایک بھاری آواز ابھری تو علینہ نے ایک جھٹکے سے پلٹتے ہوئے اپنے پیچھے دیکھا تھا جہاں دروازے کے قریب کھڑا مسکراتا ہوا علی شیر یاران اس کا خون خشک کر گیا تھا۔

"صبح صبح تکلیف دینے کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن کیا کیا جائے اکثر و بیشتر کسی ایک کی کرنی بہت سے بے گناہوں کو بھگتنی پڑ جاتی ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے آج آپ دونوں خواتین کو ایک گھٹیا اور مکار انسان کا بویا کاٹنا پڑ گیا ہے۔"

کمرے میں کھڑی عورت کو باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اندر چلا آیا تو فریحہ خوف زدہ نظروں سے علی شیر کی جانب دیکھتی، علینہ کے قریب کھسک آئی۔ جبکہ سراسیمگی سے اس کا بشاش چہرہ تکتی علینہ کو اس کے الفاظ آگ لگا گئے تھے۔

"اور اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کم ظرف انسان! عورتوں کو تختہ مشق بنا کے اپنا مقصد حاصل کرنے والا گھٹیا اور مکار تو کیا، سرے سے انسان ہی کہلانے کے لائق نہیں ہوتا!" نفرت سے اس کی جانب دیکھتی وہ کاٹ دار لہجے میں بولی تو علی شیر کے لبوں پہ کھیلتی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"آپ واقعی کافی باہمت لڑکی ہیں علینہ! جو ان حالات میں بھی صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے کی جرأت رکھتی ہیں۔ میں آپ کے کہے سے سو فیصد متفق ہوں لیکن کیا ہے کہ میرا ایک اصول ہے جو آپ کے ساتھ جیسا سلوک کرے، اس کے ساتھ ویسے ہی پیش آؤ تاکہ دوبارہ وہ کبھی آپ کو نقصان پہنچانا تو دور، آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ کر سکے۔

اسد اعوان نے، آصف میر کے ساتھ مل کے میری عزت پہ وار کیا ہے۔ میں اگر چاہتا تو آدھے گھنٹے کے اندر اندر اسے حوالات کی سیر کروا کے سچ بولنے پہ مجبور کر سکتا تھا، لیکن میں اسے یہ جتانا اور سکھانا چاہتا ہوں کہ علی شیر یاران کی عزت اور غیرت کو للکارنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے اور ویسے بھی کچھ حقیقتیں آپ پہ بھی منکشف کروانا ضروری تھیں، ورنہ میرا کام تو صرف اس کی بہن کو یہاں لا کے بھی پورا ہو سکتا تھا۔"

اس نے ایک نظر علینہ کے پہلو میں چپکی کھڑی، ڈری ہوئی فریحہ پہ ڈالی تو وہ مزید علینہ کے اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگی۔ جس کے نتیجے میں علینہ نے بے اختیار اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا تھا۔ یوں جیسے اسے اپنے ساتھ کا یقین دلانا چاہ رہی ہو۔

اس کی اس لاشعوری حرکت پہ علی شیر نے بڑی دلچسپی سے علینہ کے صبیح چہرے کی جانب دیکھا تھا۔ جو خود بھی ان ہی حالات کا شکار تھی کہ جس میں فریحہ گرفتار تھی، مگر پھر بھی وہ بھرپور ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بڑی بہن کی طرح اسد کی چھوٹی بہن کو خود سے لگائے کھڑی تھی۔ وہ واقعی خود سے جڑے ہر رشتے کی حفاظت کرنا خوب جانتی تھی۔

"اتنا تردد؟ اور وہ بھی میرے لیے؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مسٹر علی شیر! آپ نے تو بڑے زعم سے کہا تھا کہ آپ دوسروں کی چیزوں کی طرف نظر اٹھا کے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے، پھر آج آپ کی اصول پسندی کہاں گئی؟"

اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔ تو علی شیر محظوظ سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے بے اختیار آگے بڑھ آیا۔

اس کے حرکت میں آتے ہی جہاں علینہ کا رنگ اڑا تھا وہیں وہ فریحہ کو ساتھ لگائے تیزی سے پیچھے ہٹی

تھی۔

"مان گئے، بڑی مخلص اور محبت کرنے والی لڑکی ہیں آپ۔۔۔ لیکن کاش کہ آپ کا ہونے والا ہم سفر بھی آپ کے لیے اتنا ہی باوفا ساتھی ثابت ہو سکتا جتنی کہ آپ اس کے لیے ہیں۔ وہ کتنے پانی میں ہے صرف یہی دکھانے کے لیے آج اپنے اصولوں سے انحراف کیا ہے۔۔۔ لگے ہاتھوں ایک کے بجائے اگر دو مقصد پورے ہو جائیں تو کیا برا ہے۔"

اس نے کندھوں کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ علینہ کے چہرے پہ تنفر در آیا۔

"واقعی! شرفاء کی عزت سے کھیل جانے میں بھلا برائی ہی کیا ہے؟ کس قدر خود غرض شخص ہیں آپ۔ آپ کے نزدیک اہم ہے تو صرف آپ کی عزت اور آپ کے مقصد۔ باقی آپ کی وجہ سے چاہے کوئی زندہ درگور ہو جائے آپ کی بلا سے۔۔۔ آپ تو میرے تصور سے بھی بڑھ کے گرے ہوئے انسان نکلے ہیں۔ میرا بس چلے تو میں۔۔۔"

الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ علی شیر نے ایک جست میں درمیانی فاصلہ عبور کرتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کے ایک جھٹکے سے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ اس کی اس حرکت پہ جہاں فریحہ بے اختیار چیخی تھی۔ وہیں علینہ کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔

"بتاؤں میں گراوٹ کسے کہتے ہیں؟" وہ اسے اپنی مضبوط گرفت میں جکڑے برف سے ٹھنڈے لہجے میں غرایا تو علینہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں مارے دہشت کے پانی بھر آیا۔ وہ اس کے اس قدر قریب تھا کہ علینہ نے دیوانہ وار نفی میں سر ہلاتے ہوئے بے اختیار اپنا چہرہ دائیں جانب موڑ لیا۔

"پلیز علی! مجھے چھوڑ دیں۔" بہتے اشکوں کے درمیان اس نے کپکپاتے لہجے میں استدعا کی تھی اور علی شیر کو اپنی ساری وحشت، ہوا میں دھواں بن کے اڑتی محسوس ہوئی تھی۔

بکھری لٹوں کے درمیان، چاند چہرے پہ چمکتے آنسو اور پسینے کے قطرے کانپتے لبوں پہ اس کا ابھرتا ہوا اضطراب وہ ایک پل کے لیے اس کے چہرے پہ سے نگاہیں ہٹانا بھول گیا تھا۔

"جاؤں سو جان سے اس طرز تکلم کے نثار
پھر تو فرمایئے، کیا آپ نے ارشاد کیا؟"

دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے اس کی ایک لٹ کان کے پیچھے اڑستے ہوئے علی شیر نے مخمور سے لہجے میں شعر پڑھا تو مارے ذلت کے علینہ نے روتے ہوئے اپنی آنکھیں اور لب سختی سے بھینچ لیے۔

اس کا یوں بے اختیار ہو کے رو پڑنا علی شیر کو بھی جیسے ہوش میں لے آیا تھا۔ اس کا یہ ڈرا سہما بے بس سا انداز اس پہ بالکل نہیں جچ رہا تھا۔ وہ تو سر اٹھائے باوقار انداز میں ہی بات کرتی اچھی لگتی تھی۔

اک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے، نرمی سے علینہ کے بازو چھوڑ دیے تھے اور خود رخ موڑ گیا تھا۔ وہ حقیقتاً "اس لڑکی کی دل سے عزت کرتا تھا۔

"خود اعتمادی اچھی چیز ہے مس علینہ! لیکن حد سے بڑھی خود اعتمادی کبھی کبھی آپ کو مصیبت میں بھی گرفتار کروا دیتی ہے۔ آئندہ اس بات کا خیال رکھیے گا۔" سپاٹ سے لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

علینہ کے لیے مزید اپنی بے جان ٹانگوں پہ کھڑے رہنا ممکن نہ رہا۔

اگلے ہی پل وہ دو زانو زمین پہ گرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اسے یوں روتا دیکھ کے فریحہ تیزی سے آگے بڑھی تھی۔ اس کے اپنے آنسو اس لمحے بے اختیاری کے عالم میں بہہ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

ڈی سی کے آفس میں مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ وہاں موجود سب ہی افراد کی نظریں کمرے کے وسط میں کھڑے اسد اعوان پہ جمی تھیں۔ جو لب کچلتا اپنی ذلت و رسوائی کے لیے حوصلہ مجتمع کر رہا تھا۔ جبکہ آصف میر دم سادھے پریشان نظروں سے اسد کا نچڑا

ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

ابھی گھنٹہ پہلے ہی تو دونوں کی فون پہ بات ہوئی تھی اور اسد نے چہکتے ہوئے لہجے میں "سب ٹھیک ہے" کی نوید سناتے ہوئے، علی شیر کی متوقع جگ ہنسائی کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس کے ساتھ خوب اونچے اونچے قہقہے لگائے تھے۔ پھر اچانک یہ کیا ہو گیا تھا کہ یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی اسے چوکیدار نے وی سی صاحب کا پیغام دیتے ہوئے فوراً "ان کے آفس میں پہنچنے کے لیے کہا تھا اور جب وہ پر اعتماد چال چلتا ان کے کمرے میں داخل ہوا تھا تو اندر کا منظر اس کے اوسان خطا کر گیا تھا۔

صوفے پہ وی سی اور چیئرمین کے برابر کروفر سے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا علی شیر باران اور کمرے کے وسط میں مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا اسد اعوان ایک پل کے لیے تو اسے اپنی نظر کا دھوکا محسوس ہوئے تھے۔ لیکن جوں ہی اصغر صاحب نے اسے اندر آنے کے لیے کہتے ہوئے مغیث اور داور کے برابر میں جگہ سنبھالنے کے لیے کہا تھا، وہ حیران سا، سارے منظر کو بے یقین نظروں سے دیکھتا ہوا صوفے پہ آ بیٹھا تھا۔

بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اس نے متفکر نگاہوں سے اسد کا چہرہ دیکھا تھا جو لب کاٹتے ہوئے نجانے کس گہری سوچ میں غرق تھا کہ اس نے ایک بار بھی آصف کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کا انداز چیخ چیخ کر ان کی ہار کا اعلان کر رہا تھا۔ کب؟ کیسے؟ آصف کا شل ہوتا ذہن سمجھنے سے قاصر تھا۔

"جی اسد اب کہیں کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟"

وی سی نے ایک نظر آصف پہ ڈالتے ہوئے اسد کی جانب دیکھا تو اس کا شائیں شائیں کرتا دماغ بالکل خالی سا ہو گیا۔ نگاہیں اٹھاتے ہوئے اس نے خالی نظروں سے سامنے موجود علی شیر کے چہرے کی جانب دیکھا تھا۔ یہ آخری لمحوں میں کیا ہو گیا تھا؟ بازی کیونکر اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی؟ وہ فاتح سے مفتوح کیسے بن گیا تھا؟

بے اختیار اس کے ذہن کی خالی اسکرین پہ گھنٹہ بھر پیشتر کا واقعہ روشن ہوا تھا، جب وہ سرشار سا آصف سے بات کرنے کے بعد یونیورسٹی آنے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ معاً "رخشندہ بیگم کی چیخ و پکار نے اسے بوکھلا کے لاؤنج کی جانب بھاگنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

روتی چیختی ماں اور فون کان سے لگائے بے یقین کھڑے اکبر اعوان نے اس کے قدموں میں بجلی بھر دی تھی۔ بستر سے دوڑ کے آتی فروا بھی نا سمجھی کے عالم میں ماں کا بازو تھامے پریشان سی کھڑی تھی۔

"کیا بات ہے؟ کس کا فون ہے؟" کہتے ہوئے اس نے ریسیور باپ کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگایا تھا اور دوسری جانب بلکتی ہوئی فریحہ کی آواز سن کے اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

"ڈیڈی! پلیز ڈیڈی! مجھے بچا لیں۔ یہ یہ لوگ ۔۔۔"

بات ابھی اس کے منہ میں ہی تھی کہ ریسیور اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا گیا تھا۔

"ہیلو! ہیلو فری۔" اسد نے دیوانہ وار بہن کو پکارا تھا۔ تب ہی دوسری طرف سے ایک انجانی آواز ابھری تھی۔

"بہن کی سلامتی چاہتے ہو تو سیدھا وی سی کے آفس میں جا کے ساری سچائی بیان کر دو اور اگر تم نے اپنے کسی بھی حمایتی کو مطلع کرنے کی غلطی کی تو نتائج کے ذمہ دار تم خود ہو گے!"

اس کے ساتھ ہی لائن کٹ گئی اور اسد کے لیے ساری صورت حال پہ یقین کرنا اور پھر گھر والوں کو سمجھانا از حد مشکل ہو گیا تھا۔ جن کا اشتعال آدھی ادھوری بات سن کے ہی قابو سے باہر ہو گیا تھا۔

اکبر اعوان نے زندگی میں پہلی بار اکلوتے بیٹے پہ ہاتھ اٹھایا تھا۔ جس کی غلط روش نے آج ان کی عزت کو داؤ پہ لگا دیا تھا۔ اندھا دھند گاڑی دوڑاتے وہ اگلے پندرہ منٹ میں یونیورسٹی میں تھا۔ وی سی کے آفس میں قدم رکھتے ہی اس کی پہلی نظر مکمل اطمینان سے بیٹھے علی شیر پہ پڑی تھی اور اسے اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ علی شیر باران جو کچھ کہتا ہے، حقیقتاً "بہت سوچ سمجھ کے کہتا ہے اور اب وہ اس کے کہے کے عین

مطابق، اسی جگہ پہ، اپنے میر صاحب کے رچائے ڈرامے پہ سے پردہ اٹھانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

✡ ✡ ✡

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ اپنے جلن اور حسد کے ہاتھوں تم اتنا گر جاؤ گے آصف! کہ نہ صرف تم باران صاحب کی عزت سے کھیل گئے بلکہ مغیث کی زندگی، اس کا کیریئر تک تم نے داؤ پہ لگا دیا۔ آج اگر علی شیر اس اسد اعوان سے سچ نہ اگلواتے تو میں تو مغیث احمد کے خلاف ایف آئی آر کٹوانے والا تھا۔

باران صاحب تم پہ دھوکا دہی کا کیس کرتے ہیں یا نہیں، مگر میں تم پہ اس یونیورسٹی کا ماحول خراب کرنے اور یہاں شرپسندی پھیلانے کے چارجز لگا کے یہاں سے فارغ کرتا ہوں۔"

اسد کے منہ سے ساری حقیقت سن کے اصغر صاحب کسی آتش فشاں کی طرح، ساکت کھڑے آصف میر کے سر پہ پھٹے تھے۔ جس کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے ایک لفظ بھی نہیں بچا تھا۔

علی شیر باران کو زمین کی دھول چٹوانے کے چکر میں وہ خود اپنا بوریا بستر یہاں سے گول کروا بیٹھا تھا۔ وہ بھی اپنے سب سے بڑے حریف کے سامنے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسد اعوان کو گولیوں سے بھون ڈالتا، جس نے نہ صرف اس کی اتنے سالوں کی محنت کو مٹی میں ملا ڈالا تھا بلکہ اسے اپنی پارٹی کی ساری قیادت کے سامنے جو لبدہ بھی بنا دیا تھا۔

"تمہیں مجھ سے غداری بہت مہنگی پڑے گی اسد! بہت مہنگی۔" وہاں موجود لوگوں کی پرواہ کیے بنا وہ انتہائی سرد لہجے میں خاموش کھڑے اسد کو دھمکی دیتا، ایک جھٹکے سے پلٹ کے باہر نکل گیا تھا اور ساکت کھڑے اسد کی رنگت متغیر ہو چلی تھی۔

"سر پلیز، پلیز مجھے معاف کر دیں۔ یقین جانیں میں نے یہ سب آصف کے مجبور کرنے پہ کیا تھا، ورنہ میں اس پلان کے نہ صرف خلاف تھا بلکہ میں نے اسے یہ قدم اٹھانے سے منع بھی کیا تھا۔ آپ چاہیں تو میری اس بات کی تصدیق، فرحان، عمر اور واحد سے بھی کروا سکتے ہیں۔ وہ تینوں بھی اس وقت وہیں تھے۔ پلیز، پلیز سر میں بہت بہت شرمندہ ہوں۔

سر پلیز! مجھے معاف کر دیں، میں مجبور کر دیا گیا تھا۔ اب بھی آپ سب کے سامنے وہ مجھے دھمکی دے کے گیا ہے۔ کیا یہ میری بات کی تصدیق کے لیے کافی نہیں؟"

وہ چہرے پہ دنیا بھر کی مسکینی طاری کرتے ہوئے بولا

"ہوں، ٹھیک ہے۔ لیکن تمہیں نہ صرف مغیث سے بلکہ باران صاحب سے بھی معافی مانگنی پڑے گی۔" وہ جیسے کسی نتیجے پہ پہنچتے ہوئے بولے تو اسد کے مرجھائے ہوئے چہرے کی رنگت قدرے بحال ہو گئی۔

"میں، میں دونوں سے معافی مانگوں گا۔"

"مجھے اس کی معافی کی ضرورت نہیں اصغر صاحب!" علی شیر نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بے زاری سے کہا۔

"ہاں! لیکن یہ مغیث سے سارے اسٹوڈنٹس اور اسٹاف کے سامنے معافی مانگ کر اپنے جھوٹ کا اعتراف کرے گا۔" اس نے اک نگاہ غلط اسد پہ ڈالے بنا اصغر صاحب سے کہا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسد کی جانب دیکھا۔

"ٹھیک ہے! مجھے منظور ہے۔" سر جھکائے وہ دھیرے سے بولا تو علی شیر کے لبوں پہ اک فاتحانہ مسکراہٹ در آئی۔

وہ الوداعی کلمات کہتے ہوئے آفس سے باہر نکل گیا تھا۔ اسے یوں بے نیازی سے سب کے ساتھ آگے بڑھتا دیکھ کے اسد نے پریشانی سے اس کی چوڑی پشت کو دیکھا تھا۔

لب کچلتے ہوئے اس نے نا سمجھی کے عالم میں خالی پڑے آفس پہ اک نظر ڈالی تھی اور تب ہی اس کی جیب میں پڑا موبائل بج اٹھا تھا۔

تیزی سے سیل نکالتے ہوئے اس نے اسکرین پہ جگمگاتے انجان نمبر کو دیکھا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ "لیس"

کا بٹن دبا تا فون کان سے لگا گیا تھا۔

"اپنی گاڑی کے پاس پہنچو' وہاں دو آدمی تمہارے منتظر ہیں۔" بھاری لہجے نے اسے ہدایت جاری کرتے ہوئے کال ڈسکنکٹ کر دی تو اسد تیز قدموں سے پارکنگ لاٹ کی جانب چلا آیا' جہاں اپنی گاڑی کے قریب دو انجان بندوں کو کھڑا دیکھ کے وہ ایک لمحے کے لیے ٹھہر گیا۔

"چابی دو!" اس کے قریب پہنچنے پہ ایک نے تحکمانہ لہجے میں کہا تو اسد نے خائف نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چابی نکال کے اس کے حوالے کر دی۔

پچھلی سیٹ پہ اسے' دوسرے آدمی کے ساتھ بٹھا کے پہلے نے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی۔

☼ ☼ ☼

"چلو اٹھو بی بی' صاحب نے تم دونوں کو بلایا ہے۔" گھڑی دوپہر کے ڈیڑھ بجا رہی تھی' جب وہی صبح والی عورت دروازہ کھول کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

اس کے اس نئے حکم پہ علینہ اور فریحہ نے بیک وقت ایک دوسرے کو پریشان نظروں سے دیکھا تھا اور پھر آہستگی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے' وہ خوف زدہ نظروں سے ارد گرد دیکھتی اس کے پیچھے چل پڑی تھیں' جو انہیں سیڑھیوں اور راہداری سے لیتی ہوئی ایک ہال میں داخل ہوئی تھی۔

"صاحب جی! بی بیاں آگئی ہیں۔" اس کی اطلاع پہ جہاں ان دونوں نے اپنی سہمی ہوئی نگاہیں اٹھائی تھیں' وہیں کاؤچ پہ براجمان علی شیر نے اپنے سامنے اور اس کے مقابل کھڑے اسد نے بے تابی سے پلٹ کے اپنے پیچھے دیکھا تھا اور فریحہ کے ساتھ کھڑی علینہ کو دیکھ کے وہ مارے حیرت کے گنگ ہو گیا تھا۔

"علینہ! تم یہاں؟"

"اسد بھائی!" وہ دونوں اسے اپنے سامنے پا کے بے قراری سے آگے بڑھی تھیں۔ دونوں کی آنکھیں زور و شور سے برسنے لگی تھیں۔

فریحہ تڑپ کے بھائی کے سینے سے آلگی تھی' جبکہ علینہ نے روتے ہوئے اس کے بازو سے اپنا چہرہ ٹکا دیا تھا۔

"کہو! کیسا لگا سرپرائز' اسد اعوان؟" بری طرح الجھے ہوئے اسد کو علی شیر نے سوچوں سے نکالا تو وہ پریشان نظروں سے اس کا مطمئن چہرہ دیکھنے لگا۔ اتنا تو وہ اب تک جان ہی چکا تھا کہ علی شیر جیسا بندہ کوئی بھی کام بنا سوچے سمجھے نہیں کرتا تھا۔

علینہ کی یہاں موجودگی کے پیچھے بھی یقیناً اس کا کوئی مقصد تھا' کیا؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ مگر یکایک اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ تمہاری طرف کچھ پچھلا حساب کتاب بھی ہے۔" علی شیر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تو اسد کی آنکھوں میں پھیلی پریشانی میں گھبراہٹ بھی آن ملی۔

"علینہ تسبیح اسی حساب کی کڑی ہے۔" وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے مقابل آکھڑا ہوا تو اسد کے ساتھ ساتھ علینہ کا رنگ بھی فق ہو گیا۔

"ک۔ کیا مطلب؟" کوشش کے باوجود اسد اپنے لہجے کو لڑکھڑانے سے روک نہ سکا تھا۔

"مطلب بھی سمجھ میں آجائے گا۔ پہلے آپ دونوں تو وہاں چل کے بیٹھیں نا!" اس نے اچانک اسد سے لگی کھڑی لڑکیوں سے کہا تو دونوں چند لمحوں کی پس و پیش کے بعد ناچار صوفے پہ جا ٹکیں۔

"جی تو اسد صاحب! کیا آپ جانتے ہیں کہ آج آپ نے ڈی سی کے آفس میں آصف میر کا پردہ فاش کر کے کن لوگوں کی دشمنی مول لی ہے؟" اس نے اسد کے چہرے پہ نگاہیں جمائے' بھنویں اچکاتے ہوئے پوچھا تو اسد بے اختیاری کے عالم میں اپنا نچلا لب کاٹتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گیا۔

"لیکن اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اور آپ کی فیملی کو ان سے قانونی سیکیورٹی فراہم کر سکتا ہوں۔" وہ اس کی جانب دیکھتا پر سکون لہجے میں بولا تو اسد کی آنکھوں میں بے یقین سی حیرت در آئی۔

"مگر اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔" وہ اس کی حیران آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ تو دور بیٹھی علینہ کا دل تیزی سے ڈوب کر ابھرا۔

"کیسی شرط؟" اسد نے بے چینی سے پوچھا تو علی شیر کے چہرے پہ سنجیدگی در آئی۔

"آپ کو دونوں لڑکیوں میں سے ایک لڑکی آج رات کے لیے یہاں چھوڑ کے جانی پڑے گی۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ بنا کسی جھجک کے گویا ہوا تو مارے وحشت کے علینہ اور فریحہ کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ جبکہ اسد کا چہرہ پہلے سفید اور پھر تیزی سے سرخ ہوا تھا۔

"آں' آں۔ یہ وقت جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا ہے۔" اسے مٹھیاں بھینچتے دیکھ کے علی شیر نے بے اختیار ٹوک دیا۔ "اور ویسے بھی صرف ایک ہی رات کی تو بات ہے۔ صبح آپ کی لڑکی آپ کو مل جائے گی اور آصف میر سے بھی ہمیشہ کے لیے آپ کی گلو خلاصی کروا دی جائے گی۔" وہ دھیمی سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے بولا تو اسد کی بند مٹھیاں اور تنا ہوا چہرہ ڈھیلا پڑ گیا۔

اس کے بدلتے تاثرات پہ جہاں علی شیر کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی' وہیں اس کی جانب سے کسی شدید ردعمل کی منتظر علینہ اور فریحہ کو اس کی خاموشی' بے یقینی کے گہرے کنویں میں دھکیل گئی تھی۔

"اور اگر میں آپ کی مدد لینے سے انکار کر دوں تو؟" اسد نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا تو علی شیر کندھوں کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

"نو پرابلم۔ دونوں لڑکیاں گھر پہنچا دی جائیں گی۔ لیکن تب آپ کو میں چند اہم شرائط کے بدلے میں آغا نیوز اور آصف میر کے حوالے کر دوں گا۔" وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے سفاکی سے مسکرایا تو اسد کے چہرے پہ خوف نے اپنے پنجے گاڑ دیے۔

بہ مشکل تمام اپنے خشک پڑتے حلق سے تھوک نگلتے ہوئے اس نے ایک پریشان سی نظر صوفے پہ بیٹھی علینہ اور فریحہ پہ ڈالی تھی۔ جن کے چہرے ڈھلے ہوئے لٹھے کی مانند سفید اور آنکھیں پتھر کی طرح اس کے وجود پہ جمی تھیں۔

"میں' میں آپ کی مدد لینے کے لیے تیار ہوں۔" چند لمحے ان کی جانب دیکھنے کے بعد وہ آہستگی سے نظریں چراتا علی شیر کی طرف رخ موڑ گیا تو فریحہ کا ہاتھ اپنی چیخ کا گلا گھونٹنے کے لیے لبوں پہ آن ٹھہرا۔ جبکہ علینہ اپنے محافظ کے اس فیصلے پہ اس حد تک شاکڈ ہوئی تھی کہ اس کا ذہن بالکل خالی اور جسم مکمل طور پہ سن ہو گیا تھا۔

"ویری گڈ!" علی شیر کے لبوں کے ساتھ ساتھ پورا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ "تو پھر آپ کسے اپنے ساتھ لے کر جائیں گے؟" وہ دونوں لڑکیوں پہ ایک نظر ڈالتے ہوئے اسد کی جانب پلٹا۔

"ف' فریحہ کو!" الفاظ تھے یا کوئی بم۔ علینہ کو اپنا وجود ایک دھماکے سے اڑتا محسوس ہوا تھا۔

"منگیتر کو چھوڑ رہے ہیں؟" اس نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

میں نے جو فیصلہ کیا ہے' سوچ سمجھ کے کیا ہے۔ علینہ میری عزت تھی' ہے اور رہے گی۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں' سو ہر حال میں اپناؤں گا۔ فریحہ کو اگر یہاں چھوڑ دوں تو کل اسے کون اپنائے گا۔"

"یعنی آپ ماں' بہن' بیوی سب کو بیچنے کے لیے تیار ہیں' ایک صرف خود کو بچانے کے لیے؟ آپ جیسا بیچ اور خود غرض آدمی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ آپ سے اچھے تو وہ دلال ہیں' جو کھلے عام یہ کام۔"

علی شیر نے پھر اس کی تذلیل کی۔ آنکھوں میں شرمندگی کا گہرا احساس لیے وہ علینہ کی جانب پلٹا جو اس وقت سے ایک ہی پوزیشن میں ساکت بیٹھی اسے گھور رہی تھی۔

کچھ کہنے کی خواہش میں اسد نے الفاظ ترتیب دینا چاہے تھے۔ مگر لب کاٹتے ہوئے اپنا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ علی شیر اس دوران سینے پہ بازو باندھے مکمل خاموشی سے یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

"باران صاحب، آپ پلیز ہمیں گھر بھیج دیں۔" وہ علی شیر کی جانب پلٹتے ہوئے بولا تو وہ قصداً اسے جتانے کو دھیرے دھیرے چلتا علینہ کے پاس صوفے پہ آبیٹھا۔

"یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے اسد صاحب!" ٹانگ پہ ٹانگ جمائے وہ صوفے کی پشت پہ بازو پھیلا گیا۔

"جی!" نظریں چراتا وہ بے اختیار رخ موڑ گیا تو علی شیر کے لب مسکرا دیے۔

"نور الٰہی۔" اس نے باآواز بلند پیچھے کھڑے ملازم کو پکارا تو وہ سرعت سے آگے بڑھ آیا۔

"جی صاحب۔"

"اسد صاحب اور ان کی بہن کو ان کی گاڑی تک پہنچا دو۔" وہ ایک نظر پتھرائی ہوئی علینہ پہ ڈالتے ہوئے سامنے کھڑے اسد کی جانب متوجہ ہوا۔

"ایک بات اور یہاں سے جانے کے بعد کسی قسم کی ہوشیاری کرنے کی غلطی مت کرنا نہ ہی علینہ کے والدین سے کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔۔۔ آپ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ سمجھے!" وہ اسے تنبیہی نظروں سے دیکھتے ہوئے خشک لہجے میں بولا۔

"جی!" اسد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے روتی ہوئی فریحہ کا ہاتھ تھاما اور کھینچتا ہوا باہر لے گیا تو علینہ کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں جمی کہر قطرہ قطرہ اس کے چہرے پہ بہہ نکلی، وجود میں البتہ اب بھی کوئی جنبش نہ ہوئی تھی۔

اس کا مان، یقین کیا بکھرا تھا اس کے سوچنے، سمجھنے اور بولنے کی طاقت بھی جیسے سلب ہو گئی تھی۔

ان کے ہال سے نکلتے ہی چاروں طرف موت کا سناٹا چھا گیا تھا۔ علی شیر نے ایک ملال بھری نظر ذرا فاصلے پہ بیٹھی آنسو بہاتی علینہ پر ڈالی تھی اور پھر بے اختیار لب بھینچ گیا تھا۔

دل سے جڑی ہستیاں جب آپ کی آنکھوں میں موجود یقین اور روح میں پنپتے مان کی دھجیاں بکھیر دیتی ہیں تو انسان غم اور بے یقینی کے کسی سمندر میں خود کو غرق محسوس کرتا ہے، وہ اس اذیت سے بخوبی واقف تھا۔

اک بوجھل سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے اس نے ہاتھ کے اشارے سے وہاں موجود ملازمین کو باہر جانے کے لیے کہا تھا اور پھر دھیرے سے خود سے بھی بیگانہ بیٹھی علینہ کی جانب رخ موڑا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ اسد اعوان جیسا سطحی اور گرا ہوا انسان کسی بھی طرح آپ کے لائق نہیں۔" اس کی آنکھوں سے بہتے اشکوں پہ نگاہیں جمائے وہ نرم لہجے میں بولا تو ساکت بیٹھے بت میں جیسے دھیرے سے جان پڑ گئی۔

اگلے ہی لمحے وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تو علی شیر کتنی ہی دیر تاسف بھری نظروں سے اس کے لرزتے وجود کو دیکھتا رہا، جو نجانے کس کس یاد کس کس احساس کو رو رہی تھی۔

"آپ میرے بارے میں کیا خیالات رکھتی ہیں، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔ لیکن میں کل بھی دل سے آپ کی عزت کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہوں۔ میری نیت میں آپ کے حوالے سے نہ کل کوئی کھوٹ تھا اور نہ آج کوئی کھوٹ ہے۔ میں نے جو کچھ بھی کیا، جو کچھ بھی کہا، وہ صرف ایک گھٹیا شخص کی گھٹیا اور خود غرض سوچ کو آپ پہ واضح کرنے کے لیے کیا۔ یہ بتانے کے لیے کیا کہ کم از کم آپ سے میں نے اپنے احساسات ______ کے بارے میں غلط بیانی نہیں کی۔

میں جانتا ہوں کہ اسد اعوان کو پرکھنے کے اس چکر میں آپ کو بہت درد، بہت تکلیف سے گزرنا پڑا ہے۔ لیکن یقین مانیں علینہ! یہ اذیت اس تکلیف سے بدرجہا بہتر ہے، جو آپ کو اس کی شریک حیات بن کے قدم قدم پہ جھیلنی پڑتی لیکن تب واپسی کا راستہ بند ہو چکا ہوتا اور پتا نہیں کیوں لیکن میں آپ کو کسی بند گلی کا مسافر بنتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔"

وہ دھیرے دھیرے بولتا نظریں چرا گیا تو علینہ، جو پہلے ہی جذباتی اور اعصابی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی، ایک جھٹکے سے سر اٹھاتے ہوئے چلا اٹھی۔

"میں اب بھی ایک بند گلی میں ہی آکھڑی ہوئی ہوں علی شیر باران! تم مجھے یہاں اٹھا کے لائے ہو، بیاہ کے نہیں۔" اس کی بات پہ نہ چاہتے ہوئے بھی علی شیر کی پیشانی پہ شکنیں نمودار ہو گئی تھیں۔

"میں نے اگر آپ کو ایک بند گلی میں لا کھڑا کرنا ہوتا تو یہ ساری کارروائی کل رات کو کرواتا، آج صبح آپ کے یونیورسٹی آنے اور آپ کے ڈرائیور کے چلے جانے کے بعد نہیں۔ اسد اعوان اور آصف میر کو اگر میں نے کل شام کی مہلت دی تھی تو صرف آپ کی وجہ سے اور اب بھی اگر میں نے اسے، آپ کے پیرنٹس سے کچھ نہ کہنے کی ہدایت دی ہے تو صرف آپ کے لیے کیونکہ آپ کی فیملی کو تو پتا بھی نہیں کہ آپ یونیورسٹی نہیں پہنچیں۔"

علینہ اس کے منہ سے یہ ساری تفصیل سن کے آنسو بہانا بھول گئی تھی۔ اس کی سرخ متورم آنکھوں میں چھائی حیرت علی شیر کو اک گہرا سانس لینے پہ مجبور کر گئی تھی۔

"میں نے آپ سے کہا تھا نا علینہ! کہ آپ کو یہاں کچھ حقیقتیں واضح کرنے کے لیے لایا گیا ہے اس کے علاوہ میرا کوئی مقصد نہ تھا۔ میں کسی دوسرے کو آپ کو دھوکا دیتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا کجا کہ خود آپ کو رسوا کروں گا؟ میں بہت برا انسان سہی لیکن خود سے جڑے رشتوں کو تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

اس کی جانب لو دیتی نگاہوں سے تکتے ہوئے علی شیر نے اس کی بات کا حوالہ دیا تو دم سادھے بیٹھی علینہ اس سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ اس سے بھلا اس کا کیا رشتہ تھا؟

"اب آپ پلیز اٹھیں اور منہ ہاتھ دھو کے اپنی حالت درست کریں۔ تاکہ میرا ڈرائیور آپ کو وقت پہ یونیورسٹی واپس پہنچا سکے۔" نچلے لہجے میں کہتا وہ اٹھ کھڑا ہوا تو علینہ کے مردہ تن میں جیسے کسی نے نئی روح پھونک دی۔ کیا دعائیں ایسے بھی مستجاب ہوا کرتی ہیں؟ اس کی بے یقینی عروج پہ تھی۔

"فیروزہ!" علی شیر نے پلٹ کے کسی کو پکارا تو وہی صبح والی عورت دروازہ کھول کے اندر چلی آئی۔

"بی بی کو باتھ روم لے جاؤ اور ان کی چیزیں ان کے حوالے کرو اور فیاض سے کہو کہ گاڑی نکالے۔" وہ علینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکمیہ لہجے میں بولا۔

"چلیں بی بی۔"

علینہ اپنے ساتھ پیش آنے والے معجزے کو پوری جان سے محسوس کرتی اپنے رب کا شکر بجا لائی۔

"جائیں علینہ! وقت خاصا کم ہے۔" اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے علی شیر نے نرمی سے اسے احساس دلایا تو وہ اپنے سامنے کھڑے شخص کو گہری نظروں سے دیکھتی آگے بڑھ گئی، جو اس کا محسن تھا یا گناہ گار وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

واپسی کا سفر جیسے کسی خواب کے گمان میں طے ہوا تھا۔ علی شیر باران کے ڈرائیور سے کہہ کے اس نے گاڑی یونیورسٹی سے تھوڑی دور رکوائی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے کسی اجنبی کی گاڑی سے اترتا دیکھ کے غلط مطلب نکالے۔

گاڑی سے اتر کے وہ تیز قدموں سے یونیورسٹی کی جانب چل دی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں بار بار بھر آ رہی تھیں۔ جنہیں ٹشو سے پونچھتے وہ مسلسل خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر درد اتنا شدید تھا کہ اس کی ہمت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ٹوٹتی چلی جا رہی تھی۔

بالآخر خود کو گھسیٹتی وہ پارکنگ میں پہنچی تو نظر سیدھی اپنی مخصوص جگہ پہ کھڑی مانوس ریڈ کار اور ڈرائیور پہ جا ٹکی۔

آنکھوں میں پھیلتی نمی میں یک لخت تیزی محسوس کر کے علینہ نے اپنی آنکھیں زور سے رگڑتے ہوئے اک گہرا سانس لیا تھا اور پھر تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی جانب چلی آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

دوپہر گھر پہنچنے پہ اس نے اپنی دگرگوں حالت کو

طبیعت خرابی کا نام دیتے ہوئے اپنے کمرے کی راہ لی تھی۔ جس کے بعد اسے اب کہیں جا کے اپنی پیشانی پہ محسوس ہونے والے ٹھنڈے ٹھنڈے نم احساس کے زیر اثر ہوش آیا تھا۔

آنکھیں کھولنے پہ اسے ماں کا متفکر چہرہ نظر آیا تھا جو اس پہ جھکی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھیں۔ اسے آنکھیں کھولتا دیکھ کے بے اختیار انہوں نے شکر کا سانس لیا تھا۔

"امی پانی۔" خشک لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے دھیرے سے کہا تو صوفیہ بیگم نے پاس رکھے جگ میں سے پانی گلاس میں ڈالا۔ پھر اسے سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟" تھوڑا سا پانی پی کے اس نے گلاس پیچھے کر دیا۔ صوفیہ بیگم نے نرمی سے اس کے بال چہرے سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بیڈ کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے نقاہت سے بولی۔

"صبح تمہارے بابا نے منع بھی کیا تھا کہ آج یونیورسٹی جانے کی ضرورت نہیں۔ اب دیکھ لیا اپنی ضد کا نتیجہ۔ اتنا تیز بخار تھا کہ مجھے بالآخر تمہارے بابا کو گھر بلوانا پڑا۔"

وہ اس کی کمر کے پیچھے تکیہ رکھتے ہوئے بولیں تو یونیورسٹی کے نام پہ علینہ کا سویا ہوا ذہن جیسے جاگ سا گیا۔ ساتھ ہی وہ تلخ ترین واقعہ اپنی پوری جزئیات سمیت دماغ کی اسکرین پہ روشن ہوا تو اس کی بوجھل آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔

اس کے مشفق ماں باپ، اس کی ذرا سی طبیعت خرابی پہ اس کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے اور اگر جو آج اس کی واپسی نہ ہوتی تو نجانے ان دونوں کا کیا حال ہوتا؟ اپنی سسکی کا گلا گھونٹنے کو وہ بے اختیار اپنا لب دانتوں تلے دبا گئی تھی۔

"اسد اعوان! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں!" دل ہی دل میں خود سے عہد کرتے ہوئے اس نے اپنے اندر اٹھتے درد کے طوفان کو بمشکل تمام برداشت کیا تھا اور پھر دھیرے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

تنہائی میسر آتے ہی، علینہ نے بیگ میں پڑا اپنا موبائل نکال کے کمرے کا دروازہ لاک کیا۔

اسد کا نمبر ملاتے ہوئے اس نے فون کان سے لگا لیا تھا۔ چند بیلوں کے بعد کال ریسیو ہوتے ہی اسد کی بے چین آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"ہیلو، کون؟ کون بول رہا ہے؟" وہ جانتا تھا کہ علینہ کا بیگ اور موبائل اس کے پاس نہ تھا۔ جب ہی اس کا نمبر اسے الجھن میں مبتلا کر گیا تھا۔

"میں ہوں علینہ!" شعلے برساتی نگاہیں اس کے ہیولے پہ جمائے وہ سرد لہجے میں بولی تو دوسری طرف موجود اسد بری طرح چونک گیا۔

"تم؟ کہاں، کہاں سے بات کر رہی ہو تم؟"

"اپنے گھر سے۔" وہ اپنے سابقہ انداز میں بولی تو اسد کی سٹی گم ہو گئی۔

"گھر؟ تم اس وقت گھر کیسے پہنچیں؟"

"کمال ہے بجائے میری خیریت پوچھنے کے تم یہ پوچھ رہے ہو کہ میں اس وقت گھر کیسے پہنچی؟" تلخ لہجے میں بولتے ہوئے اس نے اس وقت پہ زور دیتے ہوئے کہا تو دوسری جانب چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"اوہاں، یاد آیا تم تو میرا رات بھر کے لیے سودا کر کے آئے تھے ناں... اسی لیے تمہیں پریشانی ہو رہی ہے کہ کہیں علی شیر یاران ڈیل کینسل کر کے تمہیں آصف میر کے حوالے نہ کر دے۔" وہ زہرخند سی بولی تو اسد خفت زدہ لہجے میں بولا۔

"ن نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"تم نے جو ذلیل حرکت آج میرے ساتھ کی ہے، جس طرح میرا مان، میرا یقین بکھیر کے اپنی جان کے بدلے میں میری عزت گروی رکھی ہے، اس طرح تو کوئی بے غیرت سے بے غیرت آدمی بھی نہیں کرتا۔

میں پوچھتی ہوں، تمہیں یہ سب کرتے ہوئے ذرا سا بھی خوف خدا محسوس نہیں ہوا؟ تھوڑی سی بھی شرم نہیں آئی؟" بات کرتے ہوئے آنسو ایک بار پھر اس کے زرد چہرے کو بھگونے لگے تھے۔

"شرم کیسی؟ بیوی کا فرض ہے اپنے شوہر کے کام آنا، مشکل وقت میں اس کا ساتھ دینا۔ اب آخر میں بھی تو تمہیں اپناؤں گا ناں!" وہ شرمندہ ہوئے بنا انتہائی ڈھٹائی سے کہتا آخر میں اسے جتانے کو طنزیہ لہجہ اختیار کر گیا تو علینہ کے پیروں سے لگی اور سر پہ بجھی۔

"تم اگر دنیا میں بچنے والے آخری انسان بھی ہوتے ناں اسد اعوان! تب بھی میں تمہیں اپنانا تو دور تمہاری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ ویسے بھی اللہ کے فضل سے میں اپنے گھر سے جیسے گئی تھی ویسے ہی لوٹی ہوں اور وہ بھی دن کے اجالے میں۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟" اسد کی آواز میں ناقابل یقین سی حیرت در آئی تھی۔

"دیکھ لو! معجزے آج بھی ہوتے ہیں۔ لیکن صرف نیک اور مخلص لوگوں کے ساتھ۔ تم نے تو فرعون بن کے اپنے تئیں میری قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا۔ مگر اللہ نے نہ صرف میری آج حفاظت کی بلکہ تمہاری اصلیت اور کمزوری کی انتہا دکھا کے میرے کل کو بھی محفوظ بنا دیا اور میں جو کبھی یہ سوچا کرتی تھی کہ کب تمہاری ترجیحات میں میرا نام اول نمبر پہ آئے گا اب یہ جان کے مطمئن ہوں کہ تم جیسے بے غیرت، خود غرض اور بزدل انسان سے کم از کم اب میرا کوئی تعلق، کوئی واسطہ نہیں۔" وہ اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی تو دوسری طرف حیران پریشان سا اسد بوکھلا گیا۔

"پلیز پلیز علینہ ایسے مت کہو۔ دیکھو میں اپنے کیے پہ شرمندہ ہوں۔ میں اس وقت گھبرا گیا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم سے محبت..."

"محبت کا نام مت لینا اسد! یہ لفظ تمہاری زبان پہ جچتا نہیں۔" اس نے انتہائی سرد لہجے میں اس کی بات کاٹ ڈالی تو وہ چپ کا چپ رہ گیا۔

"اور اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری ذلالت کی یہ داستان صرف مجھ تک محدود رہے تو کل اپنے ماں باپ کے ساتھ میرے گھر آ کے، منگنی کی انگوٹھی بابا کے حوالے کرو، یہ کہہ کے کہ اب تم کسی اور لڑکی میں انٹرسٹڈ ہو گئے ہو۔"

اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے وہ اپنے سابقہ ٹھنڈے اور سپاٹ لہجے میں بولی تو اسد نے بے اختیار اپنا نچلا لب کاٹ ڈالا۔

"اور کل کا مطلب ہے کل مسٹر اسد! ورنہ مجبوراً مجھے اپنے پیرنٹس کو ساری حقیقت سے آگاہ کرنا پڑے گا، جو میرے خیال میں آپ جیسا نیک نام بندہ افورڈ نہیں کر سکے گا۔"

ترشی سے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے علینہ نے اسد کے جواب کا انتظار کیے بنا لائن کاٹ دی تھی۔

☼ ☼ ☼

فصیح صاحب نے پریشان نظروں سے ٹیبل پہ رکھی انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے ایک نظر ساتھ بیٹھی صوفیہ بیگم کے زرد چہرے پہ ڈالی تھی جو متوحش نگاہوں سے انہی کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

"تم نے کیا ہماری عزت کو کھیل سمجھ رکھا ہے یا میری بیٹی اتنی فالتو ہے کہ جب دل چاہا رشتہ جوڑ لیا اور جب دل بھر گیا تو رشتہ توڑ دیا؟ میں نے اپنی بیٹی تمہیں پلیٹ میں رکھ کے پیش نہیں کی تھی۔ تم لوگ خود چل کے یہاں اس کا ہاتھ مانگنے آئے تھے، پھر تمہاری جرأت کیسے ہوئی کسی اور لڑکی کی جانب دیکھنے کی؟ کیا یہی شریف لڑکوں کا وتیرہ ہوا کرتا ہے؟"

ان کا چہرہ مارے غضب کے انگارے کی طرح دہک اٹھا تھا۔ جبکہ دل تو کر رہا تھا کہ وہ سامنے بیٹھے اس بے شرم لڑکے کا منہ نوچ لیں جو کتنی دیدہ دلیری سے ان کے روبرو بیٹھا اپنا نئے معاشقے کا اعتراف کر رہا تھا۔

اسے یوں سب کے درمیان سر جھکائے لعن طعن سنتا دیکھ کے علینہ کو اپنے اندر جلتی آگ پہ ٹھنڈے

ٹھنڈے سے چھینٹے پڑتے محسوس ہوئے تھے۔
"دیکھ رہے ہو اکبر! اپنے بیٹے کے کرتوت۔ یہ کس بے شرمی سے ہمیں اپنے نئے عشق کی داستان سنا رہا ہے۔ کبھی تم نے اتنی بے غیرتی، اتنی جرأت دیکھی یا سنی ہے کہیں؟" وہ یک لخت اکبر اعوان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے تو وہ شرم سے زمین میں گڑ سے گئے۔
"میں کیا کہوں فصیح! اس لڑکے نے تو مجھے تمہارے سامنے نظریں اٹھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔۔۔ کہاں تو دن رات اس نے علینہ کے نام کی رٹ لگائی ہوئی تھی اور اب یہ اچانک۔۔۔" انہوں نے طیش سے بھرپور نظر بیٹے کے جھکے سر پہ ڈالی جو اپنے ہاتھوں پہ نگاہ جمائے، سختی سے لب بھینچے بیٹھا تھا۔
"مانا کہ اسد سے غلطی ہوئی ہے لیکن اگر وہ چاہتا تو آپ سے جھوٹ بول کر بھی یہ رشتہ ختم کر سکتا تھا۔ مگر یہ اس کی شرافت ہے کہ وہ یہاں نہ صرف خود چل کے آپ کو پوری سچائی بتانے آیا ہے بلکہ کب سے چپ چاپ بیٹھا آپ کی بری بھلی بھی برداشت کر رہا ہے۔"
"بہت شکریہ آپ کے عظیم بیٹے کا جو اس نے یہاں آنے کی زحمت فرمائی، ورنہ اگر آپ کے بس میں ہوتا تو آپ تو شاید ہمیں فون پہ بھی انکار کرنے کا تکلف نہ فرماتیں۔" انہوں نے زندگی میں پہلی بار ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے رخشندہ بیگم کو جواب دیا تو وہ جل بلا اٹھیں۔
"آپ لوگ تشریف لے جا سکتے ہیں۔" فصیح الحسن کاٹ دار لہجے میں بولتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تو رخشندہ اعوان ایک جھٹکے سے جبکہ اکبر صاحب دل گرفتی سے انہیں دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔
صوفیہ اپنی سسکی کا گلا گھونٹنے کو بے اختیار لبوں پہ ہاتھ رکھ گئیں۔ لیکن علینہ کی آنکھوں میں نہ تو کوئی آنسو چمکا تھا اور نہ ہی چہرے پہ کوئی تاثر چھلکا تھا۔
اس کے وجود سے مترشح ہوتی بے گانگی کو دیکھتے ہوئے اسد بھی اپنی جگہ سے دھیرے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا فصیح!" اکبر صاحب بوجھل لہجے میں کہتے ہوئے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئے تھے۔ ان کی اس معذرت پہ اسد کی نظریں بے اختیاری کے عالم میں لب بستہ کھڑی علینہ کی جانب اٹھی تھیں، لیکن وہاں وہی جامد سناٹا پا کے وہ بھاری قدموں سے اپنے ماں باپ کے پیچھے باہر نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

علی شیر آفس میں بیٹھا تھا جب اس کے پی اے نے اسد اعوان کی آمد سے مطلع کیا تھا۔
"کم ان۔" دروازے پہ ہونے والی دستک کے نتیجے میں اس نے باآواز بلند آنے والے کو اجازت دی تو اسد دروازہ دھکیلتا اندر چلا آیا۔
علی شیر نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے ہاتھ سے سامنے رکھی کرسی کی جانب اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے کرسی پہ بیٹھ گیا۔
"فرمایئے، کیسے زحمت کی؟" اس نے قدرے آگے کو جھکتے ہوئے اپنے بازو ٹیبل پہ ٹکاتے ہوئے قصداً انجانا لہجہ اختیار کیا تو اسد جو گہری نظریں علی شیر کے چہرے پہ جمائے ہوئے تھا دھیرے سے بولا۔
"آپ نے اگر علینہ کو گھر ہی واپس بھجوانا تھا تو پھر آپ نے میرے امتحان کا سامان کیوں کیا؟" اور علی شیر اپنا پہلا اندازہ درست ہوتا دیکھ کے دھیرے سے مسکراتے ہوئے واپس کرسی کی بیک سے ٹیک لگا گیا تھا۔
"کیسا امتحان؟ میں نے آپ کا کوئی امتحان نہیں لیا۔ ہاں لیکن آپ کی منگیتر کے آنسوؤں نے میرا ارادہ بدل دیا تو میں نے انہیں واپس بھجوا دیا۔ آپ کو تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے آپ کی منگیتر کو صحیح سلامت آپ کو واپس لوٹا دیا۔" وہ اسے جتاتے ہوئے بولا تو اسد جو کل سے اس معمے کا حل ڈھونڈ رہا تھا، علی شیر کے عام سے لب و لہجے پہ اک گہرا سانس کھینچ کے

رہ گیا۔
"وہ اب میری منگیتر نہیں رہی۔"
"واٹ!" علی شیر کے لیے یہ اطلاع حقیقتاً "نئی" تھی۔ گو کہ وہ جانتا تھا کہ اسد کی خود غرضی کی انتہا دیکھنے کے بعد علینہ کبھی بھی یہ رشتہ قائم نہیں رکھے گی، لیکن اتنا بڑا فیصلہ وہ محض ایک ہی رات میں کر لے گی، اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ جانے اس نے اپنے والدین کو اپنے اس اچانک فیصلے کی کیا وجہ بتائی ہو گی؟
"لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ آپ انہیں ہر حال میں اپنائیں گے؟" اس نے جان بوجھ کے انجان بنتے ہوئے کہا تو اسد بوجھل لہجے میں بولا۔
"یہ میرا نہیں اس کا فیصلہ تھا۔"
"او! آئی ایم سوری۔۔۔ میری وجہ سے آپ کی منگنی۔۔۔"
"اٹس او کے میری ہی غلطی تھی جو اس پہ مان رکھتے ہوئے ایک ذرا سی قربانی مانگ بیٹھا۔۔۔" وہ بددلی سے گویا ہوا تو علی شیر کا دل چاہا کہ وہ اس بے غیرت اور بے حس شخص کا منہ توڑ دے، جو ایک لڑکی کی حرمت کو داؤ پہ لگانے کو "ذرا سی قربانی" کا نام دے رہا تھا اور لڑکی بھی وہ جو اس کی اپنی عزت تھی۔
"آپ بتائیں، آپ اپنے وعدے پہ قائم تو ہیں ناں؟" اس نے متفکر نظروں سے علی شیر کی طرف دیکھتے ہوئے، اس کے دوسرے اندازے کی بھی تصدیق کر ڈالی تو وہ دل ہی دل میں اس کی کمینگی کو داد دیتا، بظاہر مسکرا دیا۔
"کیوں نہیں، آپ نے تو شرط پوری کی تھی، اب میں نے ہی ہاتھ آیا سنہرا موقع گنوا دیا تو اس میں آپ کا کیا قصور ہے۔" وہ کندھوں کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے بولا تو اسد کے چہرے پہ اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔
"شکر ہے یہ کمینہ اپنی بات سے منکر نہیں ہوا، ورنہ میں کیا کرتا۔" دل ہی دل میں سوچتے ہوئے اس نے بے اختیار سکھ کا سانس لیا تھا اور علی شیر اس کے چہرے پہ چھلکتے اطمینان کو دیکھتے ہوئے یہ سوچنے پہ مجبور ہو گیا تھا کہ کیا کوئی شخص اس حد تک بھی پستی میں گر سکتا ہے؟

☆ ☆ ☆

اس طوفان کو گزرے ایک ہفتہ گزر گیا تھا، لیکن اس کے اثرات تاحال ان کے پورے گھر پہ چھائے ہوئے تھے۔ گو کہ فصیح صاحب نے صوفیہ بیگم کو بہت سمجھایا تھا کہ وہ اللہ کا شکر ادا کریں جس نے انہیں یہ چھوٹی تکلیف دے کر آنے والی بڑی تکلیف سے بچا لیا تھا، مگر ماں ہونے کے ناتے ان کا دکھ اور آنسو بے اختیار تھے۔
ان کی تکلیف پہ علینہ کا زخمی دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا تھا، مگر وہ خود کو سنبھالے ہر ہر لمحے اپنے رویے اور الفاظ سے ان کی دل جوئی کرتی رہتی تھی۔ لیکن رات کی تاریکی میں اس کا ضبط بھی جواب دے جاتا تھا۔ اسد نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا تھا وہ اسے بھلائے نہیں بھولتا تھا اور جس کی اگر بھنک بھی اس کے ماں باپ کو پڑ جاتی تو وہ شاید اتنا بڑا صدمہ برداشت ہی نہ کر سکتے۔
وہ دن اپنی پوری جزئیات سمیت اس کے ذہن پہ جیسے چپک کر رہ گیا تھا۔ اور علی شیر یاران کی ذات ایک ناقابل فراموش حقیقت بن کے اس کے دل و دماغ تو کیا اس کے خوابوں کو بھی الجھا گئی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اسے سمجھنے اور اپنے ذہن سے جھٹکنے سے قاصر تھی۔

☆ ☆ ☆

رات اپنا نصف سفر طے کر چکی تھی۔ مگر علی شیر ڈھلتی رات سے بے خبر لان کی گیلی گھاس پہ ننگے پاؤں ٹہلتے ہوئے اپنی سوچوں میں اتنا گم تھا کہ اسے اپنے پیچھے رضا صاحب کے آنے کی بھی خبر نہ ہوئی تھی۔ جو چند لمحے اسے اپنے دھیان میں سر جھکائے ٹہلتا دیکھ کے دھیرے سے پکار بیٹھے تھے۔
"علی!" اور خود میں مگن علی شیر نے چونک کر اپنے پیچھے دیکھا تھا۔
"پاپا آپ؟" نائٹ گاؤن میں ملبوس رضا یاران کو خود سے ذرا فاصلے پہ کھڑا دیکھ کے وہ ان کے قریب چلا

آیا تھا۔

"خیر تو ہے؟" اس نے متفکر نگاہوں سے باپ کا چہرہ دیکھا تھا، جو اس کے اطمینان کو ہوتے ہوئے مسکرا دیے تھے۔

"خیر ہے یار، بس نیند نہیں آرہی تھی۔" وہ قدم بڑھاتے ہوئے لان کے وسط میں رکھی کرسیوں کی جانب چلے آئے تو علی شیر بھی ان کی تقلید میں ایک کرسی پہ آبیٹھا۔

"تو آپ نے نیند کی گولی کھالینی تھی۔" وہ ان کی بوجھل آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولا تو اک پژمردہ سی مسکراہٹ ان کے لبوں کا احاطہ کر گئی۔

"اب وہ بھی کام نہیں کرتیں۔" ان کا جواب علی شیر کو بے اختیار اک گہری سانس لینے پہ مجبور کر گیا تھا۔

"تم بتاؤ اس وقت یہاں ٹہلتے ہوئے کیا سوچ رہے تھے؟" انہوں نے اس کا کھویا کھویا سا چہرہ بغور تکتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے بھی نیند نہیں آرہی تھی۔" وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے نظریں آسمان پہ جماتا ہوا بولا تو رضا صاحب اس کے انداز دیکھتے ہوئے دھیرے سے مسکرا دیے۔

"کہیں محبت تو نہیں کر بیٹھے برخوردار؟" ان کی بات پہ علی شیر نے چونکتے ہوئے اپنی نگاہیں ان کے چہرے پہ جمادی تھیں۔

"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے محبت کا آپ کو بڑا تجربہ رہا ہے۔" ہلکی سی مسکراہٹ لیے وہ شرارت سے بولا تو رضا صاحب کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

"ہک ہا! ہمارے ایسے نصیب کہاں؟ لیکن بڑے بڑوں کو آہیں بھرتے تو دیکھا ہے ناں۔ ویسے کون ہے وہ جو میرے مغرور بیٹے کو تارے گننے پہ مجبور کر گئی ہے؟"

"ہے ایک پاکیزہ سا وجود۔" وہ مزید آنا کانی کیے بنا دھیمے سے لہجے میں بولا تو رضا صاحب اس کے الفاظ پہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"بڑے عرصے بعد کسی لڑکی کے تعارف کے لیے لفظ پاکیزہ سنا ہے۔ اچھا لگا ہے۔" وہ متانت سے مسکرائے تھے۔

"وہ خود بھی بہت اچھی ہے۔" کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہتے ہوئے علی شیر نے ایک بار پھر اپنی نظریں آسمان پہ جمادیں تو رضا صاحب نے مصنوعی خفگی سے بیٹے کو ٹوک دیا۔

"اگر اتنی اچھی ہے تو شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" ان کے سوال پہ بے اختیار اک سرد آہ اس کے لبوں کی قید سے آزاد ہو کے فضا میں بکھر گئی تھی۔

"یہی تو مسئلہ ہے، وہ خود بہت اچھی ہے جبکہ میں صرف اچھا بھی نہیں۔ مجھ جیسے برے انسان سے وہ کبھی شادی کے لیے تیار نہیں ہوگی۔" وہ سیدھا ہوتے ہوئے دل گرفتی سے بولا تو رضا باران اسے دیکھتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر ٹکا گئے۔

"ہونا چاہیے بھی نہیں۔" وہ مکمل سنجیدگی سے گویا ہوئے تھے۔ ان کی بات علی شیر کو ایک لمحے کے لیے حیران کر گئی تھی۔

"کیا مطلب؟" اس نے اچنبھے سے باپ کی جانب دیکھا تھا۔

"سیدھی سی بات ہے، اللہ تعالیٰ نے نیک مردوں کے لیے نیک عورتیں اور برے مردوں کے لیے بری عورتیں رکھی ہیں۔" اور علی شیر اپنے باپ کے منہ سے اللہ کا ذکر سن کے ساکت رہ گیا تھا۔

اس کے چہرے پہ چھائی حیرت پر رضا صاحب کے لبوں پہ اک خفیف سی مسکراہٹ اپنی چھب دکھلا کے غائب ہوگئی تھی۔

"پتا ہے علی! میں ایک عرصے خود سے الجھتا رہا کہ آخر عالیہ جیسی بددماغ اور بدزبان عورت میرا مقدر کیوں بنی؟ لیکن ایک بار ایک کالم میری نظر سے گزرا اور مجھے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ چونکہ میری ذات میں خود بے شمار کمزوریاں تھیں اس لیے اللہ مجھے کسی طور ایک اچھی عورت کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ ایک اچھی عورت کا اصل حق دار ایک اچھا مرد ہی ہوا

کرتا ہے۔۔۔ ہاں بعض دفعہ جب مجھ جیسے کسی برے آدمی کو نعمت غیر مترقبہ کی طرح کوئی اچھی عورت عطا کر دی جاتی ہے تو عموماً" وہ اسے اپنی عاقبت نااندیشی کی نذر کر ڈالتا ہے، جو اس عورت کے لیے سوائے آزمائش کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

سو اگر تمہیں قسمت سے ایک اچھی عورت مل گئی ہے تو خود کو ایک اچھا مرد بنانے کی کوشش کرو تاکہ خدا تمہارے نصیب میں اس لڑکی کا ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لکھ دے اور تمہیں مجھ جیسی اور تمہارے بچوں کو تم جیسی ناآسودہ زندگی نہ گزارنی پڑے۔"

دھیمے لہجے میں بات کرتے ہوئے آخر میں ان کی آواز کپکپا گئی تو دم سادھے بیٹھا علی شیر بے اختیار اٹھ کے ان کے قدموں میں آبیٹھا۔

"پاپا! آپ میری تکلیف سے واقف ہیں؟" اس نے ان کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھے درد سے چور لہجے میں پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں، تم میری اولاد ہو بیٹا۔ کیا مجھے اس بات کا احساس نہیں کہ ہماری گھریلو زندگی کتنی ایب نارمل ہے۔" وہ اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بوجھل لہجے میں بولے تو علی شیر جیسے تڑپ اٹھا۔

"تو آپ نے پھر اسے نارمل بنانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

"کس کے لیے کرتا؟ اس عورت کے لیے جو میرے ساتھ زندگی صرف اس لیے گزار رہی ہے کہ وہ مجبور ہے؟" ان کی آنکھیں دھواں دھواں اور پیشانی شکن آلود ہوگئی تھی۔

"نہیں اس عورت کے لیے جو ساری زندگی آپ کی جانب سے بڑھنے والے ہاتھ کی منتظر رہی، مگر زبان سے کبھی کہہ نہ سکی۔" یک لخت عالیہ باران کی بھرائی ہوئی آواز ان باپ بیٹے کے اردگرد گونج اٹھی تو دونوں نے چونک کر ایک ساتھ اس باڑ کی جانب دیکھا تھا جس کے پیچھے کھڑی عالیہ ان پہ نگاہیں جمائے ہوئے تھیں۔

ماں کو دیکھ کے علی شیر بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ عالیہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی رضا باران کے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"میں نے اگر آپ کو چھوڑ کے جانا ہوتا ناں تو دولت کی کوئی بھی زنجیر مجھے آپ کے ساتھ بندھے رہنے پہ مجبور نہیں کر سکتی تھی۔" وہ بہتے اشکوں کے درمیان بولیں تو ساکت بیٹھے رضا انہیں دیکھ کر رہ گئے۔

"آپ جسے میری خودسری کہتے ہیں وہ دراصل میری جھنجلاہٹ تھی جو آپ کی بے نیازی اور بے زاری کو جھیلتے جھیلتے اتنی بڑھ گئی کہ مجھے آپ کو تکلیف دینا اچھا لگنے لگا۔ آپ جب غصے کے عالم میں بے بسی سے چلاتے تو مجھے لگتا جیسے میں نے آپ سے اپنی توہین کا بدلہ لے لیا ہو۔ آپ کی ضد میں، میں نہ صرف اپنے گھر سے بلکہ اپنے بیٹے سے بھی دور ہوتی چلی گئی۔۔۔ مگر اب میں تھک گئی ہوں رضا! بہت تھک

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

میرے ندیم

قیمت -/275 روپے

رضیہ جمیل

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37، اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

گئی ہوں۔"

بولتے بولتے وہ رضا صاحب کے قدموں میں بیٹھ کر ان کے گھٹنوں پہ پیشانی ٹکاتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں تو رضا یاران کی آنکھیں بھی جھلملا اٹھیں۔

انا اور ضد نے ان دونوں کی زندگیوں کو کھوکھلا کر کے انہیں کس مقام پہ لا کھڑا کیا تھا' وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ مگر اب اور نہیں۔ وہ خود کو مزید تباہ نہیں کر سکتے تھے کہ عمر اور حوصلے دونوں کی نقدی کب ختم ہو جائے کچھ پتا نہ تھا۔

"آئی ایم سوری عالیہ' آئی ایم رئیلی ویری سوری!" رضا صاحب کا ہاتھ بے اختیار ان کے بالوں پہ آ ٹھہرا تھا۔ اور علی شیر کی بھیگی آنکھیں بے اختیار چھلک اٹھی تھیں۔

☼ ☼ ☼

بہار کی آمد کی خوشی میں شہر کے ایک مشہور کلب نے جم خانہ میں فلاور شو کا انعقاد کیا تھا' جس میں جاپان سے آئی چند ایکسپرٹ نے اپنے فن کا خاص مظاہرہ کیا تھا۔

فصیح صاحب چونکہ اس کلب کے ممبر تھے اور جانتے تھے کہ علینہ کو ایسی آرٹسٹک چیزوں سے کتنا لگاؤ ہے اس لیے انہوں نے بطور خاص علینہ کو اس کی فرینڈز کے ساتھ یہ ایگزیبیشن دیکھنے کے لیے بھیجا تھا۔ آج کل ان کی توجہ کا خاص مرکز ان کی بیٹی کی ذات تھی' جو انہیں ویسے بھی کچھ کم پیاری نہ تھی۔ مگر اس رخ واقعہ کے بعد سے تو وہ اس کا اور بھی زیادہ خیال رکھنے لگے تھے۔

لان سے نکل کے وہ تیز قدموں سے لابی میں داخل ہوئی تھی جب اچانک دائیں جانب موجود ہال سے نکلتا علی شیر اس سے بری طرح ٹکرا گیا تھا۔

"آئی ایم سوری' رئیلی ویری سوری۔" معذرت خواہ انداز میں دایاں ہاتھ اٹھاتے ہوئے علی شیر نے مقابل کی جانب دیکھا تھا۔ مگر اپنے سامنے علینہ کو سنبھلتے دیکھ کر وہ خوشگوار حیرت میں گھر گیا تھا۔

وہ پچھلے کتنے ہی دنوں سے علینہ سے ملنے کی کوئی ایسی تدبیر سوچ رہا تھا جو اسے ناگوار نہ گزرتی' لیکن مسلسل سوچ بچار کے باوجود بھی وہ کوئی راستہ نکالنے میں ناکام رہا تھا۔ اور اب یوں اچانک اسے اپنے سامنے پا کے علی شیر کی تو جیسے دلی مراد جیسے بر آئی تھی۔

"آپ یہاں؟" اور علینہ نے اپنے قریب ایک جانی پہچانی آواز سن کے جہاں تیزی سے سر اٹھایا تھا' وہیں اس کے دل نے بھی ایک بیٹ مس کی تھی۔

علی شیر کے چہرے پہ نگاہ پڑتے ہی وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟" اس کے قدرے کملائے ہوئے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے علی شیر نے نرمی سے پوچھا تھا۔ مگر وہ اک خاموش نظر اس پہ ڈالتی' آگے بڑھنے کو تھی کہ علی نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے سرعت سے اپنا بازو اس کی راہ میں حائل کر دیا تھا۔

"پلیز علینہ! مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں۔" وہ ملتجی انداز میں گویا ہوا تو علینہ نے ایک نظر اس کے بازو پہ ڈالتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"مگر میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولی تو علی شیر کے چہرے پہ دکھ کی پرچھائیاں در آئیں۔

"کیا میں اس قابل بھی نہیں علینہ کہ آپ رک کے دو گھڑی کو میری بات ہی سن لیں؟" اس کے لہجے میں نجانے کیا تھا کہ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی تھی۔

"پلیز علینہ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔" اس نے دھیرے سے اصرار کیا تو علینہ اک گہری سانس لیتی اثبات میں سر ہلا گئی۔

"تھینک یو' تھینک یو سو مچ' آپ پلیز یہیں ہال میں آ جائیں۔" وہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ایک جانب کو ہوا۔ علینہ سر جھکائے آگے کو بڑھی' اس کے پیچھے علی نے بھی قدم بڑھائے تھے۔ آگے پیچھے چلتے' وہ اسے لیے ایک قدرے پرسکون گوشے میں چلا آیا تھا۔

"بیٹھیں پلیز۔" علی شیر نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"جی کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟" اس نے علی کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"مجھے آپ کے فیصلے کے بارے میں پتا چلا تھا۔" گلا کھنکھارتے ہوئے علی شیر نے اس کی طرف دیکھا تھا مگر یہاں ہر قسم کے تاثرات سے عاری چہرہ دیکھ کے اس کی آنکھوں میں یک لخت ایک فیصلہ کن سی کیفیت جاگی تھی۔

"اور اب چونکہ آپ کی زندگی میں کوئی نہیں' اس لیے میں آپ کو آپ کی رضا سے اپنانا چاہتا ہوں علینہ!" اس کے چہرے کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے وہ گمبھیر لہجے میں بولا تو اس کی طرف دیکھتی علینہ ایک پل کے لیے پلکیں جھپکانا بھول گئی۔ دل کی دھڑکنوں میں یک لخت تیزی اتر آئی تھی۔

"علی صاحب! آپ نے اسد اعوان کو نیچا دکھانے کے لیے دو عورتوں کو ٹھکرا کر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی ہے۔"

"میں مانتا ہوں کہ آپ اور میں دو مختلف دنیاؤں کے لوگ ہیں۔ لیکن اپنی زندگی میں ایک مخلص اور اچھی شریک سفر پانے کے لیے میں اپنی دنیا کو چھوڑ کے آپ کی دنیا میں آنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن اس کے لیے مجھے ایک ایسے سہارے کی تلاش ہے جو جگنو بن کر زندگی کے اس سفر میں میری اندھیری راہوں کو روشن کر سکے' جو مجھے تھام سکے' میرا ساتھ نبھا سکے' جو میرے مکان کو ایک مکمل گھر کا روپ دے سکے' جو میری نسل کی عمدہ تربیت کر سکے۔

یہ میرے وہ خواب ہیں علینہ' جو ہمیشہ سے میرے اندر پنپتے رہے ہیں۔ لیکن اب میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے یہ خواب کسی کے قابل بھروسا ہاتھوں میں سونپ دوں۔۔۔ آپ کو سونپ دوں۔ کیا آپ میرے خوابوں کو سنبھالیں گی علینہ؟" جذب سے بولتا وہ علینہ کو حیران کر گیا تھا۔

یہ اس کے خواب تو نہیں' یہ تو علینہ فصیح کے خواب تھے۔ اپنے شریک سفر کے ساتھ زندگی کے سرد و گرم کو مل بانٹنے کے خواب' عزت کی ردا میں لپٹی محبت کے خواب' جو پہلے کہیں ادھورے رہ گئے تھے۔ مگر اب جن کی تعبیر سامنے کھڑی تھی۔

"پلیز علینہ! مجھے مایوس مت کرنا۔" اس کی خاموشی علی شیر کو بے چینی سے آگے جھک آنے پہ مجبور کر گئی تھی۔ اس لمحے وہ کہیں سے بھی' وہ مغرور اور انا پرست علی شیر یاران نہیں لگ رہا تھا جو علینہ کو سڑک کنارے ملا تھا۔

اس کے چہرے سے چھلکتی بے قراری اور آنکھوں میں ڈولتا رد کیے جانے کا خوف اسے ایک عام سا انسان بنا رہے تھے۔ مگر اسے اس بات کی پروا نہ تھی۔ اس کے لیے اس وقت اگر کچھ اہم تھا تو ایک صرف علینہ کی ذات اور اس کا اقرار۔

"سنبھالوں گی' لیکن ان کے بدلے میں آپ کو اپنا یقین سونپنے لگی ہوں علی! میرے اس فیصلے کو کبھی غلط ثابت مت ہونے دیجیے گا۔" نظریں جھکائے وہ دھیمے لہجے میں علی شیر کو ہفت اقلیم کی دولت تھما گئی تھی۔

وہ چند لمحے بے یقینی سے اسے دیکھنے کے بعد مارے خوشی کے حیران رہ گیا تھا۔ علینہ نے اس کا ساتھ قبول کر لیا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"کبھی نہیں۔۔۔ مر کے بھی نہیں!" وارفتگی سے اس کے چہرے کو تکتے ہوئے اس نے اپنے دل کی تمام تر سچائی سمیت اس سے زیادہ خود اپنی ذات سے وعدہ کیا تھا اور علی شیر یاران کم از کم وعدہ خلاف نہ تھا۔